لہ دعوۃ الحق

قرآن و سنت کی تعلیمات کا علمبردار

جلد نمبر : ۴ — محرم الحرام ۱۳۸۹ھ
شمارہ نمبر : ۷ — اپریل ۱۹۶۹ء

مدیر
سمیع الحق

اس شمارے میں

★

بدل اشتراک

مغربی پاکستان : سالانہ چھ روپے ، فی پرچہ ۶۰ پیسے
مشرقی پاکستان : سالانہ بذریعہ ہوائی ڈاک آٹھ روپے ، فی پرچہ ۷۵ پیسے
غیر ممالک : سالانہ ایک پونڈ

سمیع الحق استاد دار العلوم حقانیہ طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپا کر دفتر الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ربّ العالمین اس نئے سال سنہ ہجری[۱۳۸۹] کے لیل و نہار، لمحات و ساعات کو ملک و ملت کی دینی، دنیوی ترقی و استحکام کی ضیا پاشیوں سے معمور و منور فرما دے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد یحییٰ خان نے عوام کی جان و مال کی حفاظت اور آئینی حکومت کے قیام کے پیش نظر مارشل لاء کو نافذ کر دیا ہے۔ ملک میں سینکڑوں ہنگامے، قتل و غارت، تشتت و انتشار کی ناگفتہ بہ کیفیت (جو چند مہینوں سے سایہ فگن ہے) نے مارشل لاء کو دعوت دی، تاکہ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں امن و سلامتی، اتحاد و یک جہتی قائم کی جا سکے۔

کاش: قوم کے ممتاز زعماء، مشہور رہنما دین اپنی عظیم ترین قربانیاں اسلامی آئین کی ترویج کیلئے وقف فرماتے، اور پاکستان کے کروڑوں مسلمان متفقہ طور پر شریعت محمدیؐ کے نفاذ کے لئے جملہ مساعی مبذول کرتے تو ملک میں بے یقینی، بے چینی اور افراتفری کا یہ بازار گرم نہ ہوتا، اور نہ مارشل لاء کی ضرورت محسوس ہوتی ——— ہر چہ بر ماست از ما است ——— فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ۔

یہ عظیم مملکت جو صرف لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ کے نام پر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہے اور جس کے لئے چار کروڑ مسلمانوں کو درندہ صفت، خونخوار متعصب ہندوؤں کے نرغے میں بے دست و پا چھوڑ دیا گیا۔ لاکھوں فرزندانِ توحید کے خون سے افقِ ہند اب تک سرخ نظر آ رہا ہے۔ لاکھوں عصمتوں کو لوٹا گیا۔ اتنی قربانیوں، طویل و مسلسل جدوجہد سے حاصل شدہ ملک صرف اسلام ہی کے لئے قائم کیا گیا تھا، اور اسلام ہی کی بدولت زندہ و تابندہ رہ سکتا ہے۔ اس ملک میں بسنے والے جبکہ ہزاروں گروہ و نسل میں منقسم ہیں، ان میں نہ تو قومیت کا رشتہ ہے، نہ زبان کی وحدت، جغرافیائی لحاظ سے بھی اس ملک کے دونوں حصوں میں کافر دشمن کے ملک کی ہزار میل سے زیادہ مسافت حد فاصل ہے۔ یہ تمام طبقاتی اختلافات و گروہ بندیاں اسلام ہی کے قوی رشتہ میں منسلک ہونے سے ختم ہو سکتی ہیں۔ اسلام کے عالمگیر مساوات و

جمہوریت کے سایہ میں سرمایہ دار اور غریب کے باہمی کشت و خون، امت مسلمہ کو آپس میں دست و گریبان، طلبہ و مزدور اور ہر طبقہ سے وابستہ اشخاص کا اپنے حقوق طلبی کی راہ میں احتجاجی جلسے و جلوس اور ہڑتال وغیرہ تک نوبت ہی نہ پہنچتی۔ اسلام نے رواداری، امن و سلامتی، خوشحال زندگی، باہمی ارتباط و اتحاد کا جو مکمل نقشہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہ یقیناً دنیا کے کسی اور مذہب میں ملنا محال ہے۔ مذہب اسلام نے اپنے درخشندہ و تابندہ اصول صداقت کی مستحکم بنیادوں پر نہ صرف انسانی حقوق کو دنیا کے ظلمت کدہ میں اجاگر کئے ہیں، بلکہ اس کے مخصوص قوانین نے تمام مخلوق خدا کے حقوق کا تحفظ اپنے ذمہ لیا ہے۔ یہ مذہب سراپا رحمت و شفقت ہے۔ اسلام کا وسیع آئین زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ رحمت کائنات محسن انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے جان نثار صحابہؓ و تابعین نے اسلامی مساوات کا جو عملی نمونہ دنیا والوں کے سامنے پیش کیا ہے وہ کارل مارکس، اینجلز، لینن، ٹیمپلین اور سٹالن وغیرہ کے بیہودہ و خام نظریئے کب پیش کر سکتے ہیں۔ افسوس کہ آج مغربی تہذیب سے متاثر و مرعوب مسلمان طبقہ اسلامی مساوات سے بے خبر ہے، بعض بیچارے تو جنون مایوسی میں بے اختیار چیخ اٹھتے ہیں کہ اسلام میں روٹی، کپڑے، مکان، بھوک اور افلاس کا علاج موجود نہیں۔ دراصل اس قسم کے لوگ اسلام کے بین الملی اور بین الاقوامی تمام سیاسی، معاشی، معاشرتی ضوابط سے ناواقف ہیں، اسلامی اصول سے بے خبر رہنے کے موذی مرض نے ان کے دل و دماغ کو اس درجہ ماؤف و مفلوج کر دیا ہے کہ آج وہ مذہبی اقدار و شعائر کے اپنانے سے دستکش ہو چکے ہیں۔ اور غیر مسلم اقوام کے نقش قدم پر چلنے میں اپنی کامیابی کے خواب دیکھ رہے ہیں ـــ فالی اللہ المشتکی۔

اسلام نے مرد و عورت، آقا و غلام، خادم و مخدوم، سرمایہ دار و غریب، محتاج و غنی کے جملہ حقوق کی حفاظت فرمائی ہے، اس وقت ہم صرف غریب و مزدور کے تحفظ حقوق کا اجمالاً ذکر کرتے ہیں۔ ان مقدس کلمات پر غور کیجئے جو نبی رحمت کی زبان معصوم سے نکلے ہیں:

اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان لہ اخ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ۔ الخ

دراصل تمہارے بھائی تمہارے یہ خادم ہیں جن کو اللہ نے آپ کے زیر دست بنایا ہے۔ پس جس کے تصرف میں خادم ہو اسکو وہی کھانا کھلائے جو خود کھاتا ہو، اور ان کو اسی قسم کا کپڑا پہنائے جو خود پہنتا ہو۔

آنحضرتؐ نے اخوانکم کا کلمہ اس لئے مقدم فرمایا تاکہ آقا کو خادم کی اخوت و برادری کا پورا احساس ہو جائے۔

ما آمن بی من بات شبعان وجاره جائع الی جانبه وهو یعلم۔

وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں رکھتا جو پیٹ بھر کر سو جائے اور اسے اپنے پڑوسی کی بھوک کا علم ہو۔

ایک دن آنحضرتؐ کے پاس ایک محتاج کپڑا مانگنے کے لئے حاضر ہوا، آپ نے سائل سے دریافت کیا کہ آپ کا پڑوسی نہیں۔ سائل نے کہا: حضور میرے کئی پڑوسی ہیں، آپ نے فرمایا:

فلا یجمع الله بینك وبینه فی الجنة۔

پس اللہ ایسے پڑوسیوں کو جنت میں آپ کے ساتھ جمع نہیں ہونے دے گا۔

حدیث قدسی ہے:

ان الله عزوجل یقول یوم القیامة یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی فیقول ابن آدم یا رب کیف اعودك وانت رب العالمین فیقول الله اما علمت ان عبدی فلاناً مرض فلم تعده، اما انك لو عدته لوجدتنی عنده، یا ابن آدم استطعمتك فلم تطعمنی فیقول یا رب کیف اطعمك وانت رب العالمین فیقول الله اما علمت ان عبدی فلاناً استطعمك فلم تطعمه اما انك لو اطعمته لوجدت ذلك عندی یا ابن آدم استسقیتك فلم تسقنی فیقول یا رب کیف اسقیك وانت رب العالمین فیقول استسقاك عبدی فلان فلم تسقه اما انك لو سقیته لوجدت ذلك عندی۔ (مسلم)

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بنی آدم سے پوچھے گا میں بیمار ہوا تھا تو آپ نے میری عیادت نہ کی۔ پس بندہ عرض کریگا، اے میرے رب تیری عیادت کیسے کرتا جبکہ تو رب العالمین ہے۔ پس اللہ فرمائے گا تجھے معلوم نہیں، میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا، آپ نے اسکی عیادت نہیں کی تھی، اگر آپ اسکی عیادت کرتے تو مزید وہاں مجھے پاتے (یعنی میں اس عیادت کا اجر و ثواب دیتا)۔ اے فلاں! میں نے آپ سے کھانا مانگا تھا، پس آپ نے مجھے کھانا نہیں کھلایا بندہ عرض کرے گا، اے رب! میں کیسے آپ کو کھانا کھلاتا جبکہ آپ رب العالمین ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، آپ کو معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندہ نے آپ سے کھانا طلب کیا تھا تو آپ نے اسکو کھانا نہیں کھلایا۔ اگر آپ اسکو کھلاتے تو مجھے مزید وہاں پاتے۔ اے فلاں! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا۔ آپ نے مجھے پانی نہیں دیا۔ بندہ عرض کریگا، اے مولیٰ! میں تجھے کیسے پلاتا جبکہ تو

رب العالمین ہے۔ اللہ فرماتے گا فلاں شخص نے آپ سے پانی طلب کیا تھا آپ نے اسکو
پانی سے محروم رکھا اگر اسکو پانی پلاتے تو مجھے وہاں موجود پاتے۔

انما الصدقات للفقراء والمساکین، الآیۃ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، یقیناً زکوٰۃ اور صدقات واجبہ فقراء اور مساکین وغیرہ کیلئے ہیں، زکوٰۃ مالی نظام کا ایک شعبہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اصحاب نصاب پر فرض کیا ہے، جو ان سے لیکر ناداروں میں بانٹا جاتا ہے۔ اسلام اگرچہ کسی فقیر کو بھی کا دست نگر بننے کا خوگر نہیں بناتا۔ سوال وگداگری کی بری عادت نہیں سکھاتا بلکہ اطیب ما اکلتم من کسبکم۔ (اپنی کمائی سے کھانا تمام کھانوں سے زیادہ طیب ولذیذ ہے۔) سے حلال کمائی کی ترغیب دیتا ہے۔ اسی طرح یہ روایت: ما اکل احد طعاماً قط خیراً من ان یاکل من عمل یدہ وان نبی اللہ داؤد کان یاکل من عمل یدہ۔ کسب حلال کی ترغیب دیتی ہے، مگر چونکہ انسانی آبادی میں مالداری اور فقیری لازم وملزوم ہیں۔ تاکہ ایک دوسرے کے کام آسکیں۔

نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوۃ الدنیا۔ واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق۔ اس لئے متمول افراد کے سرمایہ میں بڑا حصہ فقراء ومساکین کے لئے مقرر فرمایا۔ اور زکوٰۃ کے علاوہ دیگر صدقات بھی لازم کئے۔ ان فی المال حقاً سوی الزکوٰۃ۔ تاکہ سرمایہ دار اور مفلس میں باہمی ربط واتحاد قائم ہو۔ غریب کو محل عبادت بنایا۔ تاکہ امیر غریب کی تلاش کرتا رہے۔ جسطرح نماز پڑھنے کیلئے ہم مسجد جایا کرتے ہیں، اسی طرح زکوٰۃ وصدقات کی ادائیگی کے لئے فقیر کے پاس جانا ہوگا۔ اسلام نے ایسے سرمایہ داروں کی مذمت فرمائی ہے جو بے کسوں، محتاجوں کے کام نہیں آتے۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ۔۔۔ الخ	جو لوگ سونا، چاندی کی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب الیم کی بشارت دیدیں۔
الذی جمع مالاً وعددہ۔	ہلاکت ہے اس شخص کیلئے جو مال ودولت کو جمع کرکے دن رات اسے گنتا رہے۔ اور اس کا عقیدہ ہو کہ یہ مال ودولت اسے حیات جاودانی بخشے گا۔

اسلام ایسی سرمایہ داری کی اجازت نہیں دیتا، جس میں دولت کے پجاری ظلم وستم، رشوت، مزدوروں کی حق تلفی اور محتاجوں کے خون چوسنے میں عرفی کے اس شعر کے مصداق ہوں ۔

خوس باش وخوک باش یا سگ مردار باش ہرچہ باشی باش عرفی اندکے زردار باش

کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم کی آیت کریمہ سے اس قسم کی سرمایہ داری کی مذمت واضح و ظاہر ہے۔

قرآن و حدیث کو ذرا کھول کر دیکھو تو سہی، تمہیں روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گا کہ اسلامی اصول ہوں یا مبادی، قوانین ہوں یا احکام سب میں مساوات ہی مساوات ہے۔ قرآن نے تمام انسانوں کو الذی خلقکم من نفس واحدۃ۔ (اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک نفس سے پیدا فرمایا) ایک ہی بشر کی اولاد ٹھہرایا۔ انما المؤمنون اخوۃ۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

المسلم اخو المسلم لا یخونہ ولا	مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ تو اس کے ساتھ
یکذبہ ولا یخذلہ کل المسلم	خیانت کریگا نہ اسے جھٹلائیگا۔ اور نہ رسوا کریگا
علی المسلم حرام عرضہ ومالہ	ایک مسلمان کی طرف دوسرے پر حرام ہے۔
ودمہ ۔ الخ	

یعنی ایک مسلمان کی عزت، مال و دولت، خون وغیرہ دوسرے مسلمانوں پر حرام ہے، پس وہ نہ کسی کو مارے گا، نہ کسی کی آبرو ریزی کریگا۔

مسلمان فقیر ہو یا امیر، کروڑ پتی ہو یا دانے دانے کا محتاج، سب کے سینوں میں توحید و اسلام کی وحدت موجزن ہے۔ دینی احکام ہوں یا تعزیرات سب میں مساوات کا قانون نمایاں ہے۔ مثلاً نماز کو لیجئے، یہ تمام اولادِ آدم کو ایک ہی صف میں ایک ہی جانب، ایک ہی ہیئت کے ساتھ کھڑے ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ مسجد میں جاکر نہ کسی امیر و بادشاہ کیلئے کوئی خاص ممتاز محل مقرر ہے، اور نہ کسی فقیر و گدا کو صف اول میں قیام کی ممانعت ہے، روزے میں سب یکساں، زکوٰۃ ادنیٰ متوسط اور اعلیٰ درجہ غنی پر یکساں فرض ہے، ہر ایک کے مال سے پکڑ لیا جائیگا، حج میں سب کے لئے ایک وضع قطع کا لباس، ایک ہی صدائے لبیک، ایک ہی کعبہ کا طواف، قوانین تعزیرات، زنا، چوری، لوٹ کھسوٹ، رشوت، قتل، شراب نوشی وغیرہ کی سزائیں امیر و غریب کے لئے یکساں ہیں۔ کیا سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مخزوم کی اس عورت کو اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی سفارش پر چھوڑ دیا تھا جسکو چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔؟ آنحضرت نے تو غصہ ہو کر فرمایا: تم حدود اللہ میں سفارش کی جرأت کر رہے ہو۔!

اسلام نے خلیفہ و حاکم کو اپنی ماتحت رعایا کے ساتھ جس حسن سلوک و مشفقانہ برتاؤ کے

احکامات جاری کئے ہیں، وہ دنیا کے کسی لاء میں موجود نہیں، ان ہدایات کی روشنی میں صحابہ کرام، تابعین عظام اور ہر طبقے کے سلاطین مجاہدین نے مراکش سے لیکر چین تک بسنے والے انسانوں کو مساوات کی حیات سے نوازا۔ اور اپنی مصلحانہ و عادلانہ روش سے انسانیت کے بکھرے بکھرے کروڑوں نفوس کو رشتۂ اسلام میں پرو دیا۔ عرب وعجم، ترکی و روسی، عراقی و ایرانی، یمنی و حجازی، پاکستانی و افغانی، کالے و سفید کو صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ کے رنگ میں یک جسم وجان کر دیا۔

خلفاء راشدین کی منصفانہ خلافت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا عکس ہے جو سراپا مجسمۂ رحمت تھے۔ فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک۔ (پس خدا کی خصوصی رحمت کے بدولت آپ ان کو نرم خو ہیں۔ اور اگر آپ ترش رو، سنگدل ہوتے تو ساتھی آپ کی صحبت سے کنارہ کش ہو جاتے۔)

حضورؐ کے صحابہؓ بھی امت کیلئے رحمت بنے۔ حضرت ابوبکر خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ان یتیم بچیوں کے گھر جاکر ان کی بکریاں دوھتے رہے، جن کے باپ غزوات میں شہید ہوگئے تھے۔ ایک دن صدیق اکبرؓ کی بیوی نے حلوا پکانے کا شوق ظاہر کیا تو فرمایا کہ مسلمانوں کا بیت المال خلیفہ کے عیش وعشرت کیلئے نہیں۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ رات کو مدینہ کی گلیوں میں گشت لگایا کرتے تھے۔ تاکہ اہل مدینہ کی ضروریات سے آگاہی حاصل کرکے ان کی حوائج پوری کریں۔ ایک دفعہ بازار میں ایک کمزور یہودی کو دیکھا جو دکانداروں سے بھیک مانگ رہا تھا۔ فرمایا بڑے میاں کیا کر رہے ہو؟ بڈھے نے دیکھ کر کہا، اپنا پیٹ بھرنے اور جزیہ ادا کرنے کیلئے دست سوال دراز کیا ہے۔ آپنے بڈھے کا ہاتھ پکڑا، اپنے گھر لے جاکر اسے کھانا کھلایا، پھر بیت المال کے خزانچی کے پاس جاکر حکم دیا کہ آئندہ اس بڈھے اور اس قسم کے تمام ضعفاء سے جزیہ نہ لیں اور بیت المال سے اس قسم کے محتاجوں کو اتنا وظیفہ دیا کریں، جو ان کے اہل وعیال کے بسر اوقات کے لئے کافی ہو۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ کی نگاہ ایک نحیف معصوم بچی پر پڑی۔ فرمایا کہ یہ کس کی بچی ہے جو نقاہت سے اٹھ نہیں سکتی۔ بیٹے "عبداللہ" نے عرض کیا: جناب یہ میری بچی ہے۔ کہا: کیوں کمزور ہے۔ بیٹے نے کہا کہ آپ نے ہمارے وظیفہ میں اضافہ نہیں کیا۔ اس لئے ان بچوں کا یہی عالم ہے، باپ نے کہا خدا کی قسم بیت المال سے جو ایک عام مسلمان کے لئے وظیفہ مقرر ہے وہ خلیفہ اور خلیفہ کے اقارب

کے لئے بھی مقرر ہے بعد میں اس میں اپنی طرف سے ایک کوڑی کا اضافہ نہیں کر سکتا۔ چاہے آپ کے لئے کافی ہو یا نہ ہو۔ قانونِ خداوندی کا یہ فیصلہ میرے اور تیرے درمیان ایک جیسا ہے۔

سنہ ۱۸ھ میں جب قحط پڑا تو حضرت عمرؓ زیتون کا استعمال کرنے لگے۔ پیٹ میں جب زیتون کے مسلسل استعمال سے درد کی شکایت محسوس ہونے لگی تو آپ نے پیٹ کو مخاطب کر کے فرمایا "ملک میں جب تک قحط رہے گا آپ کو زیتون ہی ملے گا" اسی قحط کے دوران جب اپنے بیٹے کو خربوزہ کھاتے ہوئے دیکھا تو سخت رنجیدہ ہو کر فرمانے لگے۔ ہمارے بھائی بھوک سے مر رہے ہیں اور تم خربوزہ کھا رہے ہو ۔۔۔ حضرت فاروقؓ جب انتہائی نحیف ہو گئے تو بعض صحابہؓ نے مرغن خوراک کھانے کا مشورہ دیا۔ فرمایا: میں اپنے اسلاف (حضرت محمدؐ حضرت ابوبکرؓ) کی سنت کیسے چھوڑوں۔

عن ابن عمر قال اهدى لرجل	ابن عمر فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک صحابی کو بکری
من اصحاب رسول الله ﷺ راس شاة	کا سر بطور ہدیہ بھیجا گیا۔ اس نے وہ سر دوسرے صحابی
فقال ان فلان احوج من اليه فبعث	کو بھیجا کہ وہ اس سے زیادہ مستحق تھا۔ اس دوسرے نے
به اليه فبعث ذلك الانسان الى آخر	تیسرے کو، یہاں تک کہ وہ سات صحابیوں کے پاس
فلم يزل يبعثه به واحد الى آخر	بھیج کر آخر کار اس صحابی کے پاس پہنچا جس نے پہلی دفعہ
حتى رجع الى الاول بعد ان تداولته	اپنے پڑوسی کو ہدیہ کیا تھا۔
سبعة۔	

سید الطائفہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لقد عهدت المسلمين وان الرجل	میں نے مسلمانوں کا ایسا زمانہ دیکھا ہے جس میں ہر ایک
منهم يصبح فيقول يا اهليه يا اهليه	مسلمان صبح اٹھ کر اپنے گھر والوں سے یتیم و مسکین
يتيمكم يتيمكم۔ الخ	اور پڑوسی کے بارے میں دریافت کرتا کہ ان کے عقاید ان
	کے حقوق ادا کر سکتے ہیں یا نہیں۔

ان مختصر قصبات پارینہ سے "قیاس کن ز گلستان من بہار مرا" اسلامی مساوات، اخوت، ہمدردی، غربا پروری کے زرین اسباق ہمیں ملتے ہیں۔ اگر اس ملک میں ارباب حکومت اور رعیت دونوں حقیقی طور پر اسلامی نظام کو اپنالیں تو نہ فقیری کیونزم کو دعوت دے سکتی ہے، اور نہ امیری مذموم سرمایہ داری کا سبب بن سکتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

سمیع الحق
محرم الحرام ۱۳۸۹ھ

افادات حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ

امراض نفسانی اور ان کا علاج

حضرت
مدنی قدس سرہٗ
کا
ایک نادر مکتوب

نفس اور شیطان انسان کے ساتھ ایسے دشمن لگے ہوئے ہیں جو کہ ہر امر خیر اور ہر عبادت الٰہی سے روکتے رہتے ہیں۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ان اعدیٰ عدوک نفسک التی بین جنبیک الحدیث۔ (سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا دشمن تمہارا وہ دشمن ہے جو تمہارے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔) حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں: وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ۔ الآیہ (سورہ یوسف) قرآن شریف میں ہے۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّکُمُ الشَّیْطٰنُ۔ الآیہ۔ (اے آدم علیہ السلام کے بیٹو! خبردار رہو کہیں تم کو شیطان فتنوں میں مبتلا نہ کر دے جیسے کہ اس نے تمہارے دونوں ماں باپ کو جنت سے ننگا کروا کر نکلوا دیا وہ اور اس کا خاندان تم کو ایسی جگہ اور اس طرح سے دیکھتا ہے جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھ سکتے الخ)

ان دونوں دشمنوں کے ہوتے ہوئے یقیناً ہر عبادت اور ہر مفید عمل اور بات میں خلل پڑیگا اور بدمزگی پیدا ہوگی۔ ان ان دونوں کے پسندیدہ کاموں میں مزہ بھی آئے گا، اور خوشی بھی ہوگی، اس کے برخلاف عقل اور فرشتے کار خیر اور مفید امور کی طرف انسان کو کھینچنے والے ہیں، قرآن مجید میں ہے، یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ۔ الآیۃ (یعنی اللہ اتارتا ہے فرشتوں کو روحوں کی معیت میں جس بندہ پر چاہتا ہے کہ اس کو ڈراؤ، میرے سوا کوئی مستحق معبودیت نہیں ہے پس مجھ سے ڈرو الخ) عقل انسان میں مثل نور آفتاب معنوی روشنی پیدا کرنے والی طاقت ہے جس سے بھلائی اور

بُرائی کی تمیز ہوتی ہے، اور اس کے ذریعے سے انسان اپنے نفع اور نقصان پر مطلع ہو جاتا ہے، اور اپنی عملی طاقتوں کو بروئے کار لاکر نفع حاصل کرتا ہے۔ اس لئے جب تک آپکا نفس آپ پر غالب ہے اس وقت تک شیطان کا تسلّط ہے۔ ہر عبادت میں خواہ نماز ہو یا تلاوتِ قرآن ہو یا اور کوئی عبادت ہو، لذت کا نہ ہونا طبیعت کا گھبرانا وغیرہ لازمی امور ہوں گے اور اسی طرح معاصی کی طرف رغبت ہوگی اور اس میں لذت آنی بھی ضروری ہوگی۔ اب اس چیز پہ قابو پانے کے لئے مختلف جدوجہد کی ضرورت ہے :-

اوّل کثرتِ ذکر خواہ قرآن حکیم پڑھنا ہو یا اللہ تعالیٰ کا نام زبان سے ہر وقت جاری رکھنا وغیرہ فرمایا جاتا ہے۔ وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ۔ الآیہ (جو شخص رحمان کے ذکر اور اس کی یاد سے غافل ہو ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیں گے وہ اس کے ساتھ جڑا رہے گا۔) غرضیکہ ذکر کی کثرت سے شیطان کا تسلّط کم ہو جاتا ہے۔ جسطرح گھر والوں کے جاگتے رہنے اور سپاہیوں کی گشت سے چوروں کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔ اگر انسان بار بار قلب کی طرف توجہ کرتا رہے یا غفلت کو دور کرنے والی تعلیم و تعلم میں مصروف رہے تو شیطانی تسلّط کمزور پڑ جاتا ہے۔

دوم امورِ عبادت کو خلافِ نفس، عادت بنا لینا۔ انسان پیدا ایسے ڈھنگ پر کیا گیا ہے کہ جس چیز پر اس کو عادی کیا جائے آہستہ آہستہ اسی کا خوگر ہو جاتا ہے، خواہ ابتداء میں اس کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اٹھانی پڑی ہو، جس طرح تمباکو کھانے حقہ پینے، افیون کھانے، چرس اور شراب پینے وغیرہ کا انسان عادی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ایسی اشیاء کے استعمال کرنے میں اس کو ابتداء میں سخت تکلیف ہوتی ہے، مگر رفتہ رفتہ اس قدر اسکی طلب اور خواہش ہو جاتی ہے کہ کھانے اور پینے پر انسان اس قدر حریص نہیں ہوتا، اور نہ اس کے نہ ملنے میں اتنی تکلیف محسوس کرتا ہے جتنی کہ ان اشیاء پر حریص ہوتا ہے اور ان کے نہ ملنے میں تکلیف پاتا ہے۔ یہی حالت امورِ عبادت اور تقربات خداوندی اور مرغوبات روحانیہ کی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اوّل قسم کے امور میں شیاطین کی اعانت ہوتی ہے۔ مگر قسم ثانی میں ان کی طرف سے رکاوٹ ہوتی ہے، اور فرشتوں کی طرف سے ضرور امداد ہوتی ہے اس لئے امورِ عبادت میں اگر تھوڑے دنوں جدوجہد کی جائے اور نفس کے خلاف سعی پیہم جاری رکھی جائے تو تھوڑے عرصہ میں ان امور کی بھی عادت ہو جائے گی۔ اور بغیر ان کے انجام دینے کے چین نہ پڑے گا۔ ذرا محنت اور دل لگانا اور مداومت ضروری ہے۔

سوئم عبادات سے مقصود تلذذ نہیں ہے، اگر ان میں لذت ہوتی تو تکلیف ہی اٹھ جاتی کیونکہ تکلیف کے معنی (الزام مافیہ کلفۃ) یعنی ایسی چیز لازم کردی جاتے جس میں انسان کو تکلیف اور مشقت ہو۔ کھانا پینا، سونا، پاخانہ کرنا، پیشاب کرنا، سانس لینا وغیرہ امور طبیعیہ تکالیف میں سے نہیں ہیں۔ مکلف اور غیر مکلف سب میں پائے جاتے ہیں۔ نفس کو ان کے ادا کرنے میں تکلیف نہیں ہوتی بلکہ مزہ آتا ہے۔ اس لئے امور تکلیفیہ میں مزہ کا ڈھونڈھنا، غیر طبعی امور کا تلاش کرنا ہے۔ اور جمع بین الضدین ہے، اصلی غرض رضاء خداوندی ہے۔ ان امور کو انجام دینے ہی سے وہ حاصل ہوتی ہے، اور روح میں پاکیزگی اور نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اس پر مداومت کرنی اشد ضروری ہے۔ اسکی فکر نہ ہونی چاہئے کہ مزہ آتا ہے یا نہیں"

صبر کن حافظ ز سختی روز و شب　　عاقبت روزے بیابی کام را

چہارم۔ ہمیشہ عبادت میں یہ خیال باندھنا چاہئے کہ میں اس احکم الحاکمین شاہنشاہ علی الاطلاق، سمیع و بصیر، عالم بمافی الصدور، شہید علی کل شئی، محیط بکل شئی کے سامنے حاضر اور کھڑا ہوں جسکے قبضۂ قدرت میں تمام زمین و آسمان اور تمام مخلوقات ہیں وہ ہی ہر نفع و نقصان کا مالک ہے۔ وہ میری معروضات اور احوال کا سننے اور جاننے والا ہے اور اس کے احسان و انعام سے میرا اور میرے ہر عضو اور ہر شئی کا وجود اور کمال ہے اور تمام نعمتیں نطفہ کی حالت سے لے کر آج تک اسی کی دی ہوئی ہیں وہ ہی میرا اور میرے ماں باپ، دادوں اور تمام اسلاف کا پالنے والا اور پیدا کرنے والا ہے۔ اگرچہ میں اس کو دیکھ نہیں رہا ہوں مگر وہ مجھ کو ہر حال میں دیکھتا ہے۔ تو انشاء اللہ تھوڑے ہی عرصہ میں مزہ اور خوف و خشیت پیدا ہو جائے گا۔ یہ خیال باندھنا کسی غیر واقعی چیز کا نہیں ہے بلکہ واقعی چیز کا خیال اور دھیان ہے جو کہ ہماری غفلتوں کی وجہ سے غیر واقعی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے اس کی مشق بڑھائیے، انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

انسان کی طبعی بات ہے کہ لذیذ کھانا خوبصورت کپڑا اچھا معلوم ہو اور جو چیز ایسی نہ ہو اس سے نفرت ہو خصوصاً جب کہ نفس امارہ غالب ہو۔ مگر دو چیزوں کا خیال رکھنا اس میں اصلاح پیدا کرتا ہے:-

اوّل یہ کہ حسب آیت۔ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا ۔ یعنی کافروں کو کہا جائے گا جب کہ وہ دوزخ پر پیش کئے جائیں گے کہ تم نے دنیاوی زندگی میں تمام لذتیں اٹھالیں اور ان سے نفع یاب ہو چکے، اب تمہارے لئے

ہمارے یہاں کچھ حصہ ان لذائذ میں سے باقی نہیں رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جب کوئی لذیذ چیز پیش کی جاتی تھی تو اس کو ہٹا دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر میں نے استعمال کیا تو مجھ کو خوف ہے کہ کہیں قیامت میں مجھ سے یہ نہ فرمایا جائے کہ تم نے دنیا میں اپنی لذتیں پوری کر لیں اب تمہارے لئے یہاں کچھ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہے: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ۔ الآیۃ۔ جو شخص ڈرا اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے، اور کھڑے ہونے سے اور اپنے نفس کو خواہشوں سے روکا اس کے لئے جنت ٹھکانا ہوگا۔ ان دونوں آیتوں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کے دھیان رکھنے کی ضرورت ہے، اور لذائذ کے انہاک سے بالخصوص جب کہ ان میں کسی طرح ممانعت ہو بچنا چاہیئے۔ ہاں اگر بغیر شدت حرص جائز طریقہ پر حاصل ہو جائیں تو ان کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔

دوم آج ہندوستان میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں، نہیں نہیں کروڑوں آدمی ہیں جو کہ مسلسل کئی کئی روز فاقوں سے بسر کرتے ہیں، مسٹر پیٹرین ۱۹۳۲ء میں لکھتا ہے کہ ہندوستان میں مسلسل فاقہ کرنے والوں کی تعداد چار کروڑ سے لیکر سات کروڑ انسانوں کی ہے۔ مسٹر اے ایس ریسل ۱۹۳۳ء میں لکھتا ہے کہ ہندوستان میں ۲۵ کروڑ سے زائد ایسے آدمیوں کی تعداد ہے جن کو پیدائش کے وقت سے مرنے کے وقت تک کبھی پیٹ بھر کر چاول بھی نصیب نہیں ہوتا اور ہزاروں آدمی تدریجی فاقہ کشی اور بھوک سے مرتے رہتے ہیں۔ یہ واقعات تو آٹھ دس برس پہلے کے ہیں، مگر آج جو حال اس گرانی اور قحط سے ہو رہا ہے وہ ظاہر ہے کہ کس قدر آدمی بھوک کی وجہ سے بنگال، آسام، اڑیسہ وغیرہ میں مر گئے۔ یوپی میں بھی اس گرانی اور قلت اجناس و خوراک کی وجہ سے ہمارے ہی بھائی بند کن تکالیف میں مبتلا ہیں، یہ بھی خدا ہی کے بندے اور ہمارے بھائی انسان ہیں کہ ان کو بدمزہ موٹے قسم کا بھی اناج نصیب نہیں ہوتا ہے کہ وہ اسی سے پیٹ کی آگ بجھائیں۔ اس کو خیال میں رکھنا چاہیئے اور جو کچھ موٹا جھوٹا کھانا، کپڑا وغیرہ مل جائے اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت سمجھ کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے اور اس کی کوئی توہین و تذلیل، اور ناشکری عمل میں نہ لانی چاہیئے۔ کیونکہ یہ امر اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے شکریہ ادا کرنے سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بڑھ کر نصیب فرمائے۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ۔ اگر تم شکرگذاری کروگے تو میں ضرور تم پر نعمتوں میں زیادتی کروں گا۔ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑانا چاہیئے کہ پروردگار تو نے ہم کو اس رزق میں اپنے کروڑوں بندوں سے اونچا بنایا

ہے اور ایسی نعمت عطا فرمائی ہے جو کہ اپنے کروڑوں کو نہیں دی۔ میں تیرا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور اس کو عاجزی کی صورت میں اس طرح تناول کیجئے جس طرح غلام اپنے آقا کی دی ہوئی چیز کو نہایت ادب اور شکریہ سے لیتا ہے اور تناول کرتا ہے، حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے کی بُرائی نہیں کی، اگر پسند آیا کھا لیا ورنہ چھوڑ دیا۔ آپؐ دو زانو بیٹھ کر کھایا کرتے تھے جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں، اور فرماتے تھے آکل کما یاکل العبدؐ۔ جسطرح غلام اپنے آقا کے سامنے کھایا کرتا ہے میں اسی طرح کھاتا ہوں۔

حسین صورت سے متاثر ہونے کا علاج | یہ بھی نفس کی طبعی بات ہے، نفس کو توڑنا چاہیئے اور ضرورت ہوتے ہوئے تباہ کرنا چاہیئے، کوئی کیسی بھی حسین اور خوبصورت ہستی ہو منی جیسی ناپاک اور بدبودار چیز سے پیدا ہوتی ہے۔ الم نخلقکم من ماء مھین۔ کیا ہم نے تم کو ذلیل اور نجس پانی سے نہیں بنایا، حیض کے خون سے اس کا جسم بنایا گیا، ہر وقت اس کے پیٹ میں نجاست موجود ہے ہمیشہ پیشاب پاخانہ جیسی نجس اور بدبودار چیز اس سے نکلتی رہتی ہے۔ آنکھ سے چیپڑ، کان سے میل، ناک سے رینٹھ، منہ سے لعاب دن و رات نکلتا ہے۔ اس کو غور کیجئے اور خوبصورت انسان کی حقیقت کو سمجھئے مرنے کے ساتھ ہی جسم پھولتا ہے، سڑتا ہے، پیپ پڑتی ہے، کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں، اس حقیقت کے ساتھ خود کو اور دوسرے انسان کو غور کیجئے تو نفس کی یہ شرارتیں محض حباب اور خیال خام معلوم ہوں گی۔

جو چمن میں گذرے تو اے صبا تو یہ کہنا بلبل زار سے
کہ خزاں کے دن بھی ہیں سامنے نہ لگانا دل کو بہار سے

جب کوئی حسین صورت نظر پڑ جائے تو فوراً یہ تصور کیجئے کہ یہ ناپاک منی اور ناپاک خون حیض سے بنائی ہوئی مورت ہے اور بدن میں سیروں نجاست اس میں بھری ہوئی ہے، صبح و شام پاخانہ اور پیشاب وغیرہ کی صورت میں نکلتی ہے اور مرنے کے بعد اسکی نہایت نفرت انگیز صورت ہونے والی ہے۔ اس واقعی بات میں غور اور دھیان برابر رکھئے۔ انشاء اللہ بے چینی وغیرہ جاتی رہے گی۔

حضرت مولانا لطافت الرحمٰن جامعہ اسلامیہ
بہاولپور

قرآن کیا سکھاتا ہے؟
اور اسکے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت

اگر سمندر کی لاتعداد موجوں کو گنا جاسکتا ہے اور روئے زمین کے وشت و بیابان کی لامحدود وسعتوں کا احاطہ کیا جاسکتا ہے تو قرآن کریم کے ان فیوض و برکات ارشادات و تعلیمات کو بھی گنا جاسکتا ہے، جو قرآن نے سکھائی ہیں۔ تاہم علی الاجمال اتنی گذارش ہے کہ قرآن جو کچھ سکھاتا ہے اور جس راہ حق کیطرف دعوت دیتا ہے۔ اس کا بیان خود قرآن نے واضح اور جامع عنوان میں فرمایا ہے: ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم۔ یعنی قرآن کریم صراط مستقیم کا داعی اور دین فطرت کا علم ہے، قرآن انسان کو انسانیت کے تقاضوں سے آگاہ کرتا ہے۔ بندگان خدا کو خدا پرستی سکھاتا ہے۔ شرک و بت پرستی کے خلاف: جاءالحق وزھق الباطل کا نعرہ بلند کرکے جہاد کی تعلیم دیتا ہے، انسان کے دل میں ایک لازوال نور ہدایت خوف و رجا، عزم و یقین، ثبات و استحکام پیدا کرتا ہے۔ سیرت و کردار، پاکیزہ اطوار، طہارت و عفت کے طور طریق، تحمل و قناعت کا ڈھنگ سکھاتا ہے۔ قرآن خدا کا دعوت نامہ ہے۔ خدا پاک کا چنا ہوا دسترخوان ہے۔ امن و سلامتی کا رہبر ہے۔ نوع انسان کو نجات و فلاح کی طرف بلاتا ہے۔ قرآن میں انسانی زندگی، عمل، عقیدہ، فکر و نظر کے تمام شعبوں کو آئینی اور اٹل طور پر بیان فرمایا گیا ہے۔ قرآن ایک ایسا قانون عطا کرتا ہے، جو انسان کے فطری تقاضوں اور پسندیدہ صلاحیتوں سے ہم آہنگ ہے۔ لہذا قرآن انسانی معاشرہ کی ملکی قومی وغیرہ ہنگامی اور ضروری تبدیلیوں پر ایک حاوی خاکہ اور لائحہ عمل اپنے اندر رکھتا ہے۔ غرض یہ کہ قرآن نے اصلاح و تعمیر کی راہ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ فرمایا گیا ہے:

ما فرطنا فی الکتاب من شیئ

قرآن جس ملک قوم میں نازل ہوا ان کے عادات و اطوار اور ضمائر و قلوب میں وہ انقلاب پیدا کیا جو دنیا بھر کی اصلاح و انقلاب کا پیش خیمہ بنا، وہ قوم، قوم عرب تھی، وہ ملک ملک عرب تھا۔ اس قوم کی اس وقت کیا حالت تھی۔ اور قرآن نے ان میں کیا انقلاب پیدا کیا۔ یہ بھی ایک طویل داستان ہے، وہ جاہل تھے ان کو عالم کر دیا، وہ بد اخلاق تھے ان کو با اخلاق بنا دیا۔ خونریز اور سفاک تھے، امن پسند اور صلح جو بنا دیا۔ بے راہ تھے ان کو راہ پر لگایا، خود اپنی اصلاح و درستی سے غافل تھے، ان کو بنی نوع انسان یعنی تمام اقوام عالم اور اولادِ آدم کیلئے ہادی اور رہنما بنا دیا ہے

درفشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا　　دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا
جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے　　کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

خلاصہ یہ کہ قرآن نے جو کچھ سکھایا اور سکھاتا ہے، انسان کو اسکی از حد ضرورت تھی، قرآن نے اس انسانی اصلاحی ضرورت کو بدرجہ اکمل پورا اور مکمل کر دیا۔ اور خدا نے فرمایا:
الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا

قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت

اس دعویٰ کا ثبوت بھی قرآن کریم نے خود فراہم فرمایا ہے:
وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین۔

اور اگر تم کو اس قرآن کے بارہ میں یہ تردد ہے کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں تو اپنے کل معاونین کو خدا کے بغیر دعوت دے کر اس کی مانند ایک مختصر صورت بنا کر پیش کرو، اگر تم سچے ہو۔ اس پر ہیبت اور عظیم الشان چیلنج کے بعد نہایت وثوق سے مخاطب قوم عرب کا مقابلہ سے عاجز ہونا اور کلام الٰہی ہونا ثابت کر کے فرمایا گیا:
فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکافرین۔
پس اگر تم ایسا نہیں کر سکتے اور ہرگز نہیں کر سکو گے، تو پھر اس آگ کے عذاب سے ڈرو جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں، اور کفار کیلئے تیار کی گئی ہے۔

نیز فرمایا :

قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیراً۔

کہہ دیجئے کہ اگر جنات اور انسان تمام اس قرآن کی مثل بنانے کیلئے مل جائیں، تب بھی اسکی مثل نہیں لاسکیں گے۔ اگرچہ باہم تعاون کر رہے ہوں۔

علاوہ بریں علمائے اسلام نے بیشمار دلائل و براہین اور تاریخی واقعات و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ یہ قرآن بشر کا کلام نہیں ہو سکتا۔ عرب قوم کے فصحاء و بلغاء نے آیات قرآنیہ سن کر اور دیکھ کر برجستہ کہہ دیا :

ما ھذا قول البشر ان ھو الا قول خالق القوی القدر۔

قرآن کے اعجاز اور کلام الٰہی ثابت کرنے کیلئے علماء قرآن نے ضمنی طور پر اپنی اپنی تفاسیر میں وجوہات اور اسباب کا بہت ذخیرہ جمع کیا ہے۔ علامہ جار اللہ زمخشریؒ، امام فخرالدین رازیؒ، جلال الدین سیوطیؒ، علامہ آلوسیؒ وغیرہ سب نے اس مقصد کو مدلل اور مبرہن کر دیا ہے، اور قاضی ابوبکر باقلانیؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب "اعجاز القرآن" لکھی ہے، جو اپنے موضوع میں نہایت بہترین کتاب ہے، اس میں اعجاز قرآن کے بیشمار وجوہ مذکور ہیں، جن میں سے چند ایک کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

۱۔ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی ایک وجہ جس کا تعلق پورے قرآن سے ہے، وہ یہ کہ اس کے الفاظ و عبارات کا طرز اور اسلوب اس طرز سے "کلیۃً" الگ ہے، جو انسانی کلام میں معہود اور متعارف ہے، اور اس کا اسلوب خطاب اس سے بالکل مبائن اور ممتاز ہے، جو انسان کے کلام کیلئے عادتاً ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے اخیر میں ان کے الفاظ یہ ہیں :

"فھذا اذا تأملہ المتأمل تبین لہ بخروجہ عن اصناف کلامھم واسالیب خطابھم انہ خارج عن العادۃ وانہ معجز وھذہ خصوصیۃ ترجع الی جملۃ القرآن۔

یہ وہ حقیقت ہے کہ جس پر غور کرنے والا جب بھی غور کرتا ہے تو وہ صاف جانتا ہے کہ قرآن تمام اصناف کلام اور انسانی خطاب کے طریق و عادات سے باہر ہے، اور یہ خصوصیت پورے قرآن کی طرف راجع ہے۔

۲۔ عرب قوم کے مشہور بلیغاء کے کلام میں ایسا کوئی کلام نہیں ملتا، جو اس قدر طول کے باوجود فصاحت و بلاغت روانی اور سلاست کے علاوہ عجیب و غریب لطیف و دقیق معانی اور فوائد و حکم پر مشتمل ہو۔ اور اول سے آخر تک اس معجزانہ انداز میں متناسب اور متشابہ ہو ——— فرمایا ہے:

قل لو کان من عند غیر اللّٰہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا۔

کہہ دیجئے اگر یہ قرآن خدا کا کلام نہ ہوتا، تو اس کے طرز بیان میں ضرور تفاوت پایا جاتا۔
علامہ جار اللہ زمخشری صاحب کشاف نے اور دوسرے مفسرین نے اس اختلاف کثیر کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اس صورت میں پورا قرآن فصیح و بلیغ نہ ہوتا، کیونکہ خدائے پاک کے علاوہ کہنے والے کے کلام میں مخصوص حالات کے ماتحت بڑا تغیر پایا جاتا ہے ——— اور ایک انسان سے عام حالات میں فصیح و بلیغ ہونے کے باوجود اور بلند سے بلند کلام پر قادر ہونے کے باوصف کبھی ایسا کلام صادر ہو جاتا ہے جس میں کوئی فصاحت و بلاغت نہیں ہوتی یہاں جس طرز کی طرف آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا گیا ہے، وہ نہایت واضح ہے۔ کیونکہ اچھا بھلا عقلمند انسان بھی کبھی ناگوار حالات سے اس قدر اثر پذیر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی متانت اور اپنے توازن کو کھو بیٹھتا ہے۔

ایک صاحب نے لکھا ہے کہ میں نے ایک پریشانی کے دوران جیب سے ماچس نکال کر سگریٹ کو آگ لگائی، اور پھر سگریٹ کو زمین پر پھینک کر جلتی ہوئی دیا سلائی کو ہونٹوں میں دبایا، جب ہونٹ جل گیا تب ہوش آیا۔

۳۔ ظاہر ہے کہ قرآن مختلف اغراض و مقاصد اور گوناگوں مضامین پر حاوی ہے، قصص و مواعظ' وعد و عید' احکام و امثال، ترغیب و ترہیب پاکیزہ اخلاق و عادات کی تعلیم وغیرہ سب کچھ اس میں ہے، مگر ہر قسم کے عزوہ خوص، اور تجسس و تلاش سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی ایک مضمون میں قرآن کا طرز بیان زوردار ہے، اور کسی دوسرے مضمون میں وہ زور بیان اور روانی مفقود ہے، بخلاف اس کے انسان جس قدر بھی بلند پایہ فصیح و بلیغ شاعر یا خطیب ہو، اسکو لازمی طور پر بعض مضامین سے خصوصی لگاؤ اور ربط ہوتا ہے۔ اور بعض دیگر کیساتھ اس درجہ وابستگی نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے ان مضامین میں اس کا اسلوب کلام مختلف ہوتا ہے۔ اور اس کے رجحانی تفاوت کے سبب دونوں کلاموں میں نمایاں فرق ہوتا ہے، اور

جس مضمون سے ربط نہ ہو یا ہو مگر کم اس میں بیان کی خامی ظاہر ہو جاتی ہے:

ولذلک یضرب المثل بامرء القیس اذا رکب وبالنابغة اذا رھب وبزھیر اذا رغب۔

اور یہی وجہ ہے کہ امرءالقیس شہسواری میں ضرب المثل ہے۔ نابغہ ذبیانی دھمکی اور ڈرانے میں اور زہیر رغبت وطلب میں۔

۴۔ انسان جب کبھی ایک غرض سے دوسری غرض کی طرف یا کسی تمہید و توطیہ سے مقصد کی جانب منتقل ہوتا ہے، تو ضرور تحول و انتقال میں کوئی نہ کوئی نقص دخلل، تصنع اور تکلف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ہاں قرآن چونکہ خدا کا کلام ہے، اس لئے وہ اس بے ربطی اور گراوٹ سے پاک ہے۔ اس سلسلہ میں قاضی باقلانی فرماتے ہیں:

وتبیّن ان القرآن علی اختلاف ما یتصرف فیه من الوجوہ الکثیرة والطرق المختلفة یجعل المختلف کالمؤتلف والمتباین کالمتناسب والمتنافر فی الافراد الی حد الآحاد وھذا امر عجیب تبین فیه الفصاحة وتظھر فیه البلاغة ویخرج به الکلام عن العادة ویتجاوز العرف۔

اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ قرآن باوجود اس کے کہ اس میں ہر طرح کے مختلف مضامین اور مقاصد کی خاطر تصرف و تحول ہوتا ہے۔ مگر اس قرآنی نظم میں یہ خوبی ہے کہ غیر مربوط کو مربوط اور متباین کو متناسب بناتا ہے، گویا وہ تمام اغراض ایک مسلسل مقصود کے اجزاء ہیں۔ اور اس امر عجیب سے قرآن کی فصاحت و بلاغت ظاہر ہوتی ہے، اور انسانی عرف و عادات کے حدود سے متجاوز اور وراء الوراء ہوتا ہے۔

۵۔ قرآن جس مفہوم کو اپنی عبارت میں ادا کرتا ہے، اس کی تمام کیفیات اس معنی کے داخلی اور خارجی حالات وقت ماحول اور متکلم کے اثرات اور احساسات غرض یہ کہ حقیقت حال کا پورا خاکہ بلا کم و کاست اپنی تعبیر میں پیش کرتا ہے۔ اور ان تمام رموز و اشارات کی ترجمانی کرتا ہے، جو اس موقعہ اور محل میں ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے۔ کہ حالات کے ان تمام ظاہری اور باطنی تقاضوں کا علم رکھنا اور پھر ان کو الفاظ کے قالب میں پورا پورا منتقل کرنا صرف اس خدا کا کام ہو سکتا ہے، جو علام الغیوب ہے۔ اور لایعزب عنه مثقال ذرة فی الارض ولا فی السماء وھو السمیع العلیم۔ جس کی شان ہے۔ قرآن کے کلام اللہ ہونے کے

بارہ میں علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم فتح الملہم میں فرماتے ہیں:
بعض علماء نے قرآن کی وجوہ اعجاز کو چار میں جمع کر دیا ہے۔ ایک اس کے الفاظ کی اچھی اور مناسب ترکیب اور کلمات کا پیوند و ارتباط باوجود ایجاز اور بلاغت کے۔ دوسرا اس کے سیاق اور طرز و طریق کی وہ عمدگی جو اہل بلاغت کے طرزوں سے یکسر مخالف اور بالاتر ہے، نہ تو انکی نظم میں یہ طرز ہے، اور نہ نثر میں۔ یہاں تک کہ ان کی عقلیں حیران ہوتیں، اور اسکی مثل لانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور پھر اس پر قرآن نے اپنا چیلنج باربار اعادہ کر کے ان کے عجز کو ظاہر کر دیا، تیسری وجہ یہ ہے کہ قرآن گذشتہ اقوام و ملل شرائع و ادیان کے ان حالات پر مشتمل ہے جن کا علم شاذ و نادر اہل کتاب علماء کے علاوہ کسی کو نہ تھا، چوتھی وجہ آئندہ حالات و واقعات سے درست اور صحیح اطلاع دینا ہے، جن میں بعض زمانہ رسالت میں اور بعض مستقبل میں بعینہ اس بیان کردہ طور پر واقع ہوئے، آگے چل کر علامہ مذکور فرماتے ہیں:
کلام الٰہی ہونے کی وجوہات میں جن میں سے یہ بھی ہے کہ پڑھنے والا اس کے بار بار تلاوت اور دھرانے سے ملول نہیں ہوتا، بلکہ اسکو تازگی اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ پھر متعلمین کیلئے اس کا حفظ آسان کر دیا گیا ہے۔ اور پڑھنے والوں کیلئے اس کی ترتیل و تجوید سہل کر دی گئی ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن نے اپنے علوم و معارف اور حقائق اور خوبیوں کو جمع کر دیا ہے، جن کے فوائد و عجائب اختتام پذیر نہیں ہوتے۔ ؎ ہو المسك ماکررتہ یتضوع
صاحب دائرۃ المعارف فرماتے ہیں کہ قرآن کو خدا نے اپنی طرف سے روح کہا ہے:

وکذلك اوحینا الیك روحا من امرنا

تو ــــ اس لحاظ سے قرآنی روح اجسام و ابدان میں ایک ایمانی زندگی اور غیر فانی حیات پیدا کر دیتی ہے، اور انسانی کلام ہر چند لذیذ اور مؤثر ہو، وہ ہنگامی طور پر تاثیر یا نشاط و سرور تو پیدا کرتا ہے۔ مگر اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا، بیشک قرآن کی روحانیت دل و گردہ پر براہ راست اثر ڈالتی ہے۔

قرآن کے محفوظ ہونے کا ثبوت

اس کیلئے بھی ـــــ ؎ آفتاب آمد دلیل آفتاب ـــــ یعنی خود خداوند پاک نے نہایت تاکید سے فرمایا کہ: انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون ـــــ نیز قرآن کریم کی اس

عظیم تر اور بہ وجوہ محفوظیت کا اعتراف بیشمار غیر مسلم مفکرین بھی کرتے ہیں، چنانچہ حضرت المخدوم المعظم جناب مولانا شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم نے سر ولیم میور کا قول نقل فرمایا ہے، جو کہتا ہے کہ بارہ سو سال سے ایسی کوئی کتاب بجز قرآن کے موجود نہیں کہ اس کی عبارت مدت مدید سے خالص رہی ہو۔ (بحوالہ خدام الدین لاہور۔ شمارہ ۲۸ دسمبر ۱۹۶۸ء)

بیشک قرآن وہ کلام الٰہی ہے جس میں کسی طرح کا تغیر و تبدل نہ تو ممکن ہے، اور نہ واقع ہو گیا ہے۔ اس کلام خداوندی کا معنی اور لفظ بلکہ حرکات و سکنات تک تحریف و تبدیل سے محفوظ ہیں۔ اور موجودہ ترتیب بعینہ وہی اصل ترتیب ہے، جو حضورؐ کے ارشادات سے دی گئی تھی۔ اس بارہ میں جلال الدین سیوطیؒ، قاضی باقلانیؒ، ابوبکر جصاص رازیؒ، علامہ ابن جریر طبریؒ وغیرہ علماء قرآن نے اجماع نقل کیا ہے۔ قرآن کریم کے لفظ و نگہداشت کا یہ عالم ہے، کہ تفسیر و تشریح الفاظ و عبارات کی حدبندیوں کے علاوہ اس قدر پختہ اور ہمہ گیر انتظام کیا گیا ہے کہ اس پر تلفظ کرنے کے آداب اور طریق عمل کو بھی واضح اور متعین فرمایا گیا ہے۔ تلاوت و قرأت کے لئے چند مخصوص فصیح تر قبائل عرب کا لب و لہجہ اور طرز ادا تجویز کیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں صحابہؓ تابعین اور ائمہ قرأۃ نے متواتر اور مشہور قراءت کو نہایت احتیاط اور وثوق سے جمع کیا ہے، اور آج بنی نوع انسان کے رشد و ہدایت کے لئے یہ آسمانی منظم اور مدوّن لائحہ عمل موجود اور محفوظ ہے۔ اور تمام طاغوتی طاقتوں کے علی الرغم موجود اور محفوظ ہوگا —— لا مبدل لکلمات اللہ۔

—— پھر جبکہ اس کے تحفظ کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا تو قرآن کریم کو اس قدر طویل اور جلیل کتاب ہوتے ہوئے یاد کرنے کے لئے سہل کیا گیا ہے۔ آج تک آسمانی کتابوں میں سے کسی بھی کتاب کو یاد نہیں کیا گیا۔ مگر قرآن کو حفظ کرنے کا سلسلہ ہر دور میں جاری ہے —— امت مسلمہ کے دس کروڑ افراد کے سینوں میں قرآن محفوظ رہا ہے۔ (بحوالہ جریدۃ شہاب شمارہ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۱ء مضمون شاہ فاروقی)

علماء امت محمدیہ نے اپنے اس زادِ آخرت اور کیمیائے سعادت کی حفاظت کا اتنا بندوبست کیا ہے کہ اس کے سُوَر، رکوعات، آیات، کلمات، حروف، حرکات، سکنات سب کو ضبط میں لانے اور ان کے اعداد و شمار محفوظ رکھنے کے علاوہ یہ تک بتا دیا ہے کہ ۲۹ حروف ہجائیہ میں سے ہر حرف کتنی دفعہ قرآن میں واقع ہو گیا ہے۔ اور حرکات

میں سے ہر حرکت کتنی بار اور تشدیدات اور مدّات کتنے ہیں، اور کل نقطے کتنے ہیں، ذیل میں وہ تمام اعداد و شمار ملاحظہ ہوں۔

اجزاء	۳۰			حرکت ضمہ (پیش)	۸۸۰۴			سورتیں	۱۱۴
رکوعات	۵۵۸			حرکت فتحہ (زبر)	۵۳۴۳			حروف	۳۲۳۶۷۱
کلمات	۶۶۳۰			حرکت کسرہ (زیر)	۳۹۵۸۲			آیات	۶۶۶۶
مدات	۱۷۷۱			تشدیدات	۱۲۷۰۰			نقطہ جات	۱۰۵۶۸۴
ا	۴۸۸۷۰۰	ب	۱۱۴۲۸	ت	۱۱۰۹۵	ث	۱۲۷۶	ج	۳۲۰۰۳
ح	۳۷۹۳	خ	۲۴۱۶	د	۵۶۰۲	ذ	۴۶۷۷	ر	۱۱۷۹۳
ز	۱۵۹۰	س	۵۸۹۱	ش	۲۲۵۳	ص	۲۰۱۳	ض	۱۳۰۷
ط	۱۲۷۷	ظ	۸۴۲۰	ع	۹۲۲۰	غ	۲۲۰۸	ف	۸۴۹۹
ق	۶۸۱۳	ک	۹۵۰۰	ل	۳۰۴۳۲	م	۲۶۵۶۰	ن	۴۵۱۹۰
و	۲۵۵۳۶	ہ	۱۹۰۷	لا	۴۷۲۰	ی	۴۵۹۱۰۰		...

حرفِ آخر

یہ تو میں نے نہایت اختصار اور عجلت سے قرآن کے بحرِ محیط سے چند قطرات کی نشاندہی کی ہے۔ مگر قرآن کریم کی تحقیقات کے گرد گھومنے سے یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا، بلکہ یہاں تو تفصیل و بیان کو جہاں ختم کرنا ہو، معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے آغاز کرنا تھا۔

کان المحبۃ دائرۃ لقلبی فحیث الانتہاء الابتداء

گویا محبت میرے دل کے گرد ایک گول دائرہ ہے جس کی ابتدا و انتہا کا پتہ نہیں چلتا

علامہ ضیاپوری نے "عرائب القرآن" میں یہی کہا ہے کہ قرآن کے فضائل و کمالات کو جبکہ لامتناہی ہیں، محدود و محصور حروف سے بنے ہوئے الفاظ کے احاطہ میں لانا مشکل ہے۔

وان قمیصاً خیط من نسج تسعۃ وعشرین حرفاً من معانیہ قاصر

ترجمہ: جو کپڑا انتیس حرف سے بنایا گیا ہو وہ قرآن کے معانی سمونے سے قاصر ہے۔

ولیکن ہذا آخر الکلام وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سید الانام علیہ وعلیٰ آلہ التحیۃ والسلام۔

علامہ شمس الحق افغانی مدظلہٗ

دورِ حاضر کے افکار کی بنیادی غلطی

سب سے پہلے ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ کیا دورِ حاضر کے نظریات میں غلطیاں موجود بھی ہیں یا نہیں. اس کے لئے ہمیں دورِ حاضر کے نظریات کو تقسیم کرنا پڑے گا :-

۱. خالص مادی نظریات

۲. انسان سے متعلق نظریات خواہ تمدنیات ہوں یا معاشیات و عمرانیات

۳. ماورا المادیات

ان تینوں کے ذرائع علم اور احکام و خصوصیات میں بڑا فرق ہے. دورِ حاضر کی عقلیت نے تینوں پر بحث کی ہے اور تینوں کے متعلق اس نے نظریات قائم کئے ہیں. اس میں شک نہیں کہ ان تینوں کا ایک بہت بڑی حد تک انسانی زندگی سے تعلق ہے. اور تینوں پر عقل نے اس بنا پر غور کیا کہ وہ ایسے حقائق کو پا سکے جن کی وجہ سے انسانی زندگی اپنے حقیقی مقصد میں کامیاب ہو، کیونکہ عقل کی فکری حرکت کا آغاز اسی مقصد کے لئے ہوتا ہے. اب انیسویں صدی سے لے کر اب تک تقریباً ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کی عقل کاوشوں سے اگر انسان نے اپنے مقصدِ زندگی کو پا لیا ہے تو بیشک یہ فکری اور فلسفی اور سائنسی کوششیں قابلِ تحسین ہیں اور اسکی عقل و فکر کی راہ صحیح سمت پر جانے اور منزلِ مقصود کو پانے کی صحیح راہ تھی، اور اگر زندگی کا وہ مقصد

حاصل نہیں ہوا۔ تو یقیناً ہم کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ انسانی عقلیت کی راہ صحیح نہ تھی، بلکہ اس میں غلطی واقع ہوئی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس مقصد کو متعین کریں۔ جس کے لئے عقلی حرکات کا آغاز ہوا۔ اور پھر عملی قوتوں نے ان عقلی نظریات کی موافقت کی۔

عقلی و عملی کاوشوں کے مقصد کا تعین | انسانی فکر و عمل کی تمام حرکات کا جو مقصد ہے وہ چین اور اطمینان ہے نہ سونے اور چاندی کے انبار یا قیمتی موٹریں اور نہ بڑی بڑی بلڈنگ اور سامانِ تعیش یا حکومت کا کوئی بڑا عہدہ جسکی تصدیق اس امر سے کی جاسکتی ہے۔ کہ اکثر اوقات

بے چینی | یہ سب چیزیں حاصل ہوتی ہیں، لیکن چین اور اطمینان کا نام نہیں ہوتا اگر یقین نہ آئے تو صدر جانسن اور اندرا گاندھی سے پوچھو کہ کیا تم کو ایک معمولی غریب آدمی کے برابر بھی چین حاصل ہے۔ لیکن ان دونوں کی بے چینی عام غریب اور معمولی اشخاص سے بہت زیادہ ہے۔ اس طرح یورپ اور امریکہ کے ادب پتیوں سے پوچھو کہ تم کو چین حاصل ہے تو جواب یہ ہوگا کہ نہیں۔ آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ یورپ اور امریکہ کے بہت کروڑ پتی اور ادب پتی ایسے تھے جنہوں نے دماغ کی بے چینی کی تاب نہ لاکر خود کشی کرلی۔ اور یہ تحریر چھوڑ کر مرے کہ ہم اس بے چین دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اب اگر دورِ جدید کے عقلمندوں کی عقلی و عملی تگ و دو کی راہ صحیح ہوتی، تو چین حاصل ہوتا، لیکن اس کے برخلاف جو بے چینی انسان کو دورِ حاضر میں نصیب ہوئی، اسکی نظیر انسان کی پوری تاریخ میں نہیں مل سکتی اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ خاص کر ایٹمی دور ہائیڈروجن خطرہ نے تو بے چینی کو عالمگیر شکل دے دی ہے تو کیا یہی وہ منزلِ مقصود تھی جس کے لئے ڈیڑھ دو صدی کی یہ کوششیں عمل میں لائی گئی تھیں۔

انقلاب | مقصدِ زندگی کی نایابی کی بڑی دلیل لفظ انقلاب ہے جس کے معنی پلٹنے کے ہیں۔ اس دور میں جو نظامِ زندگی جو نظامِ مملکت جو نظامِ معیشت فکری کوششوں کے بعد قائم ہو جاتا ہے، تو اس کے بعد نعرۂ انقلاب بلند ہو جاتا ہے۔ جس کا واضح مقصد یہ ہے کہ عوام اور نعرۂ انقلاب لگانے والے موجودہ نظام سے مطمئن نہیں وہ اس کو پلٹ دینا چاہتے ہیں، گویا وہ اپنے نعرۂ انقلاب کے ذریعے اپنی بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ خدا سے مکالمہ کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے جواب میں کہ کیا یہ جہانِ جدید تم کو موافق ہے کہتا ہے کہ میں نے خدا سے کہا کہ موافق نہیں۔ ارشاد ہوا کہ اس کو توڑ ڈالو ؎

گفتا کہ جہاں ما آیا بتو می سازد — گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

بے چینی کی مثال | اس عالمی بے چینی سے یہ معلوم ہوا کہ دورِ حاضر کی فکری اور عملی کوششوں نے زندگی کو مقصود سے ہمکنار نہیں کیا۔ اور تا ہنوز زندگی نے اپنے طبعی و فطری مرکز کو نہیں پایا، اضطراب انقلاب اور بے چینی انسان کی باطنی حرکت کا نام ہے اور چین اور اطمینان اس کے اصلی سکون کا نام ہے اور وہی اصل مقصدِ حیات اور راحت گشدہ ہے۔ مثلاً پانی جب بلندی پر ہو تو وہ متحرک اور مضطرب رہتا ہے اور اگر اس کو اس بلندی سے کسی دوسری بلندی کی طرف منتقل کیا جائے تو بھی اس کا اضطراب اور تحرک ختم نہ ہوگا۔ تاوقتیکہ وہ کسی نشیب جگہ میں پہنچ کر اپنے مرکزِ فطری و طبعی کو نہ پاسکے یہی حاصل اس وقت ہماری زندگی کا ہے کہ عقل اس کو کبھی ایک چٹان اور کبھی دوسری چٹان کی طرف منتقل کرتی ہے، کبھی تیسری کی طرف، لیکن اس کے اضطراب میں فرق نہیں آتا۔ تاوقتیکہ زندگی اپنے فطری مرکز کو نہ پائے۔

اس بے چینی کا اصل سبب خالقِ کائنات سے انسانی نسل کے تعلق کا منقطع ہونا ہے اور مادہ اور مادیات ہی سے وابستہ ہونا ہے۔ مادہ متغیر ہے اور روح کے لئے وہ غیر فطری مرکز ہے اور خالقِ کائنات روحِ انسانی کا فطری مرکز ہے۔ روح جب فطری مرکز سے ہٹادی گئی اور غیر فطری مرکز سے اس کو جوڑ دیا گیا، تو اس کے معنے ہیں دوامی اضطراب اور بے چینی کا ہونا ایک لازمی بات ہے، اور مادی ترقی چاہے کس قدر بلند ہو لیکن اضطراب دور نہ ہوگا۔ اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب۔ خوب سن لو کہ صرف اللہ کی یاد اور تعلق سے انسان کو چین اور اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔

بقول اکبرؔ ؎

دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی	عشق کا تصور اور اللہ کی یاد
دنیا دنی کی ہوس جانے دو	گلچیں ہو اگر تو خار و خس جانے دو
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ	اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

لیکن تہذیب جدید کا یہ حال ہے کہ ؎

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

طریقِ مغربی کی کیا ہی روشن ضمیری ہے　　خدا کو بھول جانا اور محو ماسوا ہونا

مادیات | مادیات کی بنیاد مادہ ہے اس لئے جب تک مادہ معلوم نہ ہو تو مادیات کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ مادہ کے متعلق ہزاروں سال سے فلاسفہ کی ذہنی اور فکری کاوشیں جاری ہیں۔ لیکن ان سب میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔

مادہ قدیم فلاسفہ کی نظر میں | یونان کے فلاسفہ قدیم نے مادہ عالم کی حقیقت کے متعلق جو ریسرچ اور تحقیق کی ہے وہ شہرستانی کے ملل نحل میں موجود ہے:۔

۱۔ تھالیس کی رائے یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق عدم سے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مادہ کا وجود ضروری ہے۔ اور مادہ کائنات پانی ہے۔

۲۔ انکسیمنس کی رائے یہ ہے کہ کائنات کا مادہ ہوا ہے

۳۔ انکسمندر کی رائے یہ ہے کہ مادہ کائنات کی کوئی شکل نہیں جس کو متعین کیا جا سکے۔

۴۔ فیثاغورث کی رائے یہ ہے کہ مادہ کائنات خدا ہے جس سے کوئی چیز خالی نہیں، جسطرح کل اعداد ایک ہی کے تکرار سے بنتے ہیں، اسی طرح خدائے واحد اصل کائنات ہے۔

۵۔ اکزنوفن کی رائے یہ ہے کہ کائنات کا مادہ واحد ہے۔

۶۔ ارمیندس کی رائے یہ ہے کہ عدد مادہ نہیں بلکہ پانی اور ہوا کا مجموعہ مادہ ہے۔

۷۔ ملیسوس کی رائے یہ ہے کہ مادہ ایسی ذات ہے جو زندہ اور عاقل اور ازلی ہے۔

۸۔ ہرقلیط کی رائے یہ ہے کہ مادہ آگ ہے جو پھر منقلب ہو کر ہوا بنی اور وہ بدل کر پانی بنا۔

۹۔ امپیدوقلس کی رائے یہ ہے کہ مادہ عالم چار عناصر ہیں:۔

۱۔ ہوا ۲۔ خاک ۳۔ آب ۴۔ آتش

ان میں محبت کی قوت باہم انضمام کے لئے اور نفرت کی قوت تفریق کے لئے موجود ہے۔

۱۰۔ دیمقراطیس کہتا ہے کہ مادہ عالم ذرات ہیں جو اندرونی حرارت کی وجہ سے حرکت کرتے ہیں۔

۱۱۔ انکساغورس کہتا ہے کہ مادہ عالم ذرات متحرکہ ہیں، جن کو خدائے علیم و حکیم حرکت دیتا ہے۔

۱۲۔ سوفسطائیہ جن میں سے پروتاغوراس کی رائے یہ ہے کہ مادہ یا اور کسی چیز کا کسی کو بھی علم نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عقل اور حس صحیح ذرائع علم نہیں کیونکہ لوگوں کی حالت ان دونوں چیزوں میں متفاوت ہے بلکہ غورجیاس فلسفی کی رائے یہ ہے کہ ہر چیز کی صحیح معرفت عقل اور حس کے ذریعہ محال ہے۔

۱۳۔ سقراط کی رائے یہ ہے کہ مادہ اور دیگر اشیاء کا علم عقل کے ذریعہ ممکن ہے۔ حس کے ذریعہ ناممکن ہے۔

۱۴۔ افلاطون جو سقراط کا شاگرد ہے وہ کہتا ہے کہ مثالی اور تصوری حقائق مادہ عالم ہے۔ لیکن افلاطون اور اس کا شاگرد ارسطو دونوں خدا کے قائل ہیں کہ مادہ خدا کے بغیر کسی وجود میں متشکل نہیں ہو سکتا۔

یہ چودہ اقوال قدیم فلاسفہ کے ہیں جو ہم کو معلوم ہیں۔ نہ معلوم کہ اور کتنے اقوال ہوں گے جو ہمیں معلوم نہیں۔

مادہ جدید فلاسفہ کی نظر میں | جدید فلاسفہ یورپ اور امریکہ کی تحقیقات کو چونکہ استقرار نہیں بلکہ ان میں انقلاب اور تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اور جدید تحقیق سابق تحقیق کو رد کرتی ہے اس سے اب تک جدید فکر میں حسب ذیل تبدیلیاں ہوئیں۔

۱۔ پہلا نظریہ یہ تھا کہ مادہ عناصر کا نام ہے

۲۔ دوسرا یہ کہ مادہ سالمات یعنی ایٹمی اجزاء کا نام ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ مادہ برق پاروں کا نام ہے۔

اب تک جدید فلسفہ اسی حد تک پہنچا ہے۔ لیکن جدید فلاسفہ میں سے بعض کی تحقیق یہ ہے کہ بالآخر برقیت بھی ختم ہو جاتی ہے، اور آخر میں صرف ایک نور باقی رہ جاتا ہے۔ یہ سب خرابی اس غلط جذبے اور تخیل سے پیدا ہوئی کہ عدم اور نیستی سے کوئی چیز وجود میں نہیں آ سکتی۔ لیکن یہ خیال ہی سرے سے غلط ہے کہ نیست سے ہست نہیں ہو سکتی۔

نیست سے ہست ہونا | اسلامی زاویہ نگاہ سے کائنات عالم تو ہست سے ہست ہوئی، یعنی مادہ عالم سے عالم وجود میں آیا لیکن خود مادہ عدم سے وجود میں آیا گویا عدم سے وجود اور نیستی سے ہستی کا واقعہ موجودہ عالم سے قبل صرف ایک بار ہوا۔ ازاں بعد جس قدر قدرت کی تخلیقات ہیں وہ سب اشیاء ہست سے ہست ہوئیں۔ اب جدید فلاسفہ یا قدیم فلاسفہ جو مادے کی ازلیت کے قائل ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ مادہ اگر ازلی نہ ہو تو وہ بھی پیدا کیا گیا ہوگا اور ظاہر ہے کہ مادی اجسام مادے سے پیدا ہیں۔ لیکن مادہ عدم سے پیدا ہوا ہوگا، حالانکہ مشاہدہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جو دستیاب ہو سکتی ہو جو نیست سے ہست ہوئی ہو۔ یہ صرف مغالطہ ہے جو واقعہ مشاہدہ کرنے والوں اور مشاہدات کے وجود سے بہت پیشتر صرف ایک

ہی مرتبہ وجود میں آیا ہو۔ وہ اس زمانہ اور اس وقت کیونکر زیر مشاہدہ آسکتا ہے، جس واقعہ کو جس وقت سے اختصاص ہو، وہ ایک دوسرے وقت میں کیونکر وجود میں آسکتا ہے۔ ایک صاحب نے جو آریہ سماج کے بہت بڑے پنڈت تھے اور اس خیال کے قائل تھے کہ نیست سے کوئی چیز ہست نہیں ہوسکتی ورنہ ہمیں دکھا دو۔ میں نے کہا یہ سوال ایسا ہے کہ بغداد موجود نہیں ورنہ اسی ہندوستان میں مجھے بغداد دکھا دو جب میں مان لوں گا تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ آجاؤ ہمیں بغداد لے چلو وہیں دکھا دیں گے۔ دہلی میں ہم آپ کو بغداد کیسے دکھا سکتے ہیں، ہم بغداد کا وجود مانتے ہیں، لیکن اپنے اصلی مقام میں مانتے ہیں۔ دہلی میں ہم نے نہ بغداد کے موجود ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور نہ مشاہدہ کا، تو اسی طرح مشاہدہ جیسے مکان سے بدلتا ہے اور زمان سے بھی بدلتا ہے، اگر کوئی کہے کہ دارا اور سکندر کی جنگ ناممکن ہے ورنہ ہمیں کوئی مشاہدہ اسی زمانہ میں کرائے تو جواب یہی ہوگا کہ یہ واقعہ اپنے مخصوص زمانہ اور وقت میں ہوا، تم ہمیں اس زمانے میں پہنچا دو، تو مشاہدہ کرا دیں گے۔ اسی طرح جس وقت موجودہ نظام عالم سے قبل مادہ نیست سے ہست ہوا تو اس وقت میں ہمیں پہنچا دو تو مشاہدہ بھی کرا دیں گے۔ یہی ہے اس عظیم مسئلہ کی حقیقت جس پر موجودہ فلسفہ مبنی ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان چونکہ کوئی چیز مادہ کے بغیر پیدا نہیں کرسکتا تو اس سے خیال قائم کیا گیا کہ خدا بھی نہیں کرسکتا۔ اس نظریہ میں خدا کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کیا گیا ہے، یہ بھی بالکل غلط ہے۔ ہمیں خدا سے تو کوئی نسبت نہیں، نہ کسی چیز میں شرکت کہ وہ خالق ہے اور ہم مخلوق ہیں، لیکن مخلوق میں ایک مخلوق کی قدرت دوسری مخلوق پر قیاس نہیں کی جا سکتی۔ چیونٹی اور ہاتھی دونوں مخلوق ہیں اور دونوں حیوانیت میں شریک ہیں، لیکن ہاتھی کی قدرت چیونٹی کی قدرت پر قیاس نہیں کی جاسکتی کہ چونکہ چیونٹی بیس من بوجھ نہیں اٹھا سکتی تو ہاتھی بھی نہیں اٹھا سکتا۔ اگر کوئی یہ قیاس کرے تو بڑی غلطی کا مرتکب ہوگا، چیونٹی جو کام نہیں کرسکتی، ہاتھی وہ کرسکتا ہے لہٰذا ہم جو کام نہیں کرسکتے کہ نیست سے ہست کریں تو خالق کائنات قادر مطلق وہ یقیناً یہ کام کرسکتا ہے۔

۳۔ سائنس کے قواعد کے مطابق مادہ کی ازلیت کا تخیل استقراء اور تجربہ سے قائم کیا گیا اور استقراء اس وقت دلیل بن سکتا ہے کہ تام ہو، ورنہ بہت زمانہ تک سینما میں تصاویر متحرک نظر آتی تھیں، لیکن بولتی نہ تھیں۔ اس وقت کا استقراء یہ تھا کہ تصاویر سینما نہیں بول سکتیں

لیکن مابعد زمانہ میں جب ہونے لگیں تو وہ استقراء باطل ہوا کیونکہ یہ جدید واقعہ سابق استقراء و تجربہ کرنے والوں کے تجربہ سے خارج تھا تو ممکن ہے کہ کوئی ایسا صحیح واقعہ بھی ہو جو انسان کے تجربات سے خارج ہونے کے باوجود اپنی جگہ دو دونی چار کی طرح صحیح اور درست ہو اور وہ واقعہ نیست سے ہست ہونے کا ہے۔ اسی طرح تمام عجائبات سائنس سابق تجربہ سے خارج تھے۔ لیکن اب یہ تسلیم شدہ ہیں

۲۔ مادی اجسام مادہ سے پیدا ہوتے اور خالق کائنات نے پیدا کیا، اب خود مادہ اگر کسی اور مادہ سے پیدا ہو تو تسلسل لازم آئے گا۔ لہذا خود مادے کا وجود کسی اور مادہ سے نہیں بنا ورنہ پھر اسی دوم مادے سے متعلق سوال چلے گا جو محق ہوگا۔ لہذا اس لحاظ سے کائنات مادی ہے۔ اس کے لئے مادہ ضروری ہے لیکن خود مادہ غیر مادی ہے جس کے لئے اور مادے کی ضرورت نہیں۔ باقی اگر اس میں شبہ ہو تو خود انسانی آنکھ کے ابصار اور مشاہدہ کو دیکھو کہ تمام کائنات کا ابصار و مشاہدہ آنکھ کے ابصار سے ہوتا ہے۔ لیکن خود ابصار مبصرات سے نہیں یعنی کل چیزیں ہم نظر سے دیکھتے ہیں، لیکن خود نظر نظر نہیں آتی اور نظر کا وجود نظر آنے سے بے نیاز ہے، اسی طرح کل مادیات مادے سے بن گئے ہیں، لیکن خود مادہ مادے سے بے نیاز ہے کہ وہ کسی اور مادہ سے بن گیا ہو۔ بلکہ وہ بلا مادہ وجود میں آیا ہو۔ البتہ وجود میں لانے والے خدا کی ہستی لازمی ہے۔ یعنی مادے کے لئے مادہ دیگر کی ضرورت نہیں۔ البتہ فاعل و خالق کی ضرورت ہے، پہلی قسم یعنی افکار جدیدہ جو مادیات سے متعلق ہوں ان میں اکثر آراء صحیح ہو سکتی ہیں کہ وہ مشاہدہ اور تجربہ سے متعلق ہیں، اور مادہ چونکہ بے جان اور بے اختیار چیز ہے، اس لئے مادہ سے متعلق ایک بار بعد از تجربہ جو نظریہ قائم ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی مداخلت نہیں ہوتی اور قائم رہتا ہے۔ مثلاً اگر دو سامات (ایٹم) ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایک سالمہ کو ترتیب دی جائے تو ہر حال میں اس عمل سے پانی برآمد ہوگا۔ اس لئے اس قسم میں اختلاف کی گنجائش کم ہے۔ اور ہم بآسانی حکم لگا سکتے ہیں کہ فلاں مادی شے سے فلاں حالات و شرائط کے تحت فلاں خاصیت ظاہر ہوگی۔

انوار الحق سہمی، ایم اے، ایل ایل بی۔ ایم ای ڈی

کیا اسلامی سوشلزم کی بنیاد قرآن کا فلسفۂ حیات ہے

پہلی قسط

حیرت اور دکھ کی بات ہے کہ علمی بحثیں بھی اکثر غیر علمی رنگ اور تعصب کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس وقت میرے سامنے ڈاکٹر شوکت سبزواری کا وہ مختصر مضمون ہے جو ۱۰ فروری ۱۹۹۹ء کے "جنگ" میں چھپا تھا۔ عنوان تھا "اسلامی سوشلزم کی بنیاد قرآن کا فلسفۂ حیات ہے"۔ امید تھی کہ اس دو ٹوک اور جارحانہ عنوان کے تحت موصوف نے تحقیق کا حق ادا کیا ہو گا، اور صحیح فکر کے ٹھیک ٹھیک نتائج پیش کئے ہوں گے، لیکن مضمون جیسے جیسے نظر سے گزرتا گیا، ایسی تاریک تر ہوتی چلی گئی، مقدمات غلط، نتائج ٹیڑھے، استدلال کمزور، اور حد یہ ہے کہ قرآن کی ایک آیت کی تشریح بالکل اُلٹ!

نکتہ بہ نکتہ چلیئے، شروع میں کہتے ہیں: "سوشلزم میں کسی ایسی ترمیم کے بھی یہ حضرات روادار نہیں جو کسی اسلامی اصول کی روشنی میں اسلام سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کی جائے"۔

سوال یہ ہے کہ آخر یہ لوگ سوشلزم کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بے چین کیوں ہیں۔؟ کیا اس مصالحت (compromise) کی ضرورت اسلام کو پیش آتی ہے یا سوشلزم کو۔؟ کیا اس پیوندسازی کی تڑپ یورپ کے ان ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے، جہاں سوشلزم نے جنم لیا ہے اور جو اسی کے گہوارہ ہیں یا جدت کی یہ ترنگ محض اسی سرزمین سے اٹھی ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت رہتی ہے۔ ؟ ظاہر ہے کہ کسی سوشلسٹ معاشرے میں اس تجربہ کاری کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے جسے "سوشلزم کو اسلام سے ہم آہنگ" کرنے کا نام دیا جا رہا ہے۔ پھر وہ "اسلامی اصول" ہے کونسا جس کی روشنی میں اس "ہم آہنگی" کی پلاسٹک سرجری کا یہ کارنامہ سرانجام دیا جاسکے گا۔ قرآن تو نص قطعی کے ذریعہ یہ اعلان کر چکا کہ نوع انسانی کے لئے دین (ضابطہ حیات) مکمل ہو چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی صرف اور صرف اسلام ہی کو حاصل ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا "آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا ہے، اور تم پر اپنی نعمت کو تمام کر دیا ہے اور تمہارے اسلام کو بطور دین اختیار کرنے پر راضی ہوں۔" (المائدہ، رکوع ۱، آیت ۳)

پس صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف اسلام پوری زندگی کے لئے جامع اور مکمل نظام ہونے کا داعی ہے تو دوسری طرف سوشلزم کا دعویٰ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے، ایک طرف اہل اسلام کسی پیوندسازی کو گوارا نہیں کر سکتے تو دوسری طرف سوشلزم کے پیرو اس بات کے روادار نہیں ہو سکتے کہ کسی دوسرے نظام سے مصالحت کا کوئی فارمولا تسلیم کر لیا جائے، جو شخص یہ یقین و احساس رکھتا ہو کہ اسلام میں کچھ کمی ہے، اور اس کمی کو پورا کر کے وہ انسانی تاریخ پر کوئی احسان کر ڈالے گا، اگر اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند لگا دے، وہ اگر خود فریبی میں مبتلا نہیں تو ایک نہایت ہی سنگین فریب دہی کا مرتکب ضرور ہے۔ جب "سرمایہ دارانہ سوشلزم" جیسی کوئی چیز نہیں ہو سکتی تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ "اسلامی سوشلزم" یا "اسلامی سرمایہ داری" کے عجیب و غریب تصور کی پرورش کی جاسکے۔؟

ڈاکٹر موصوف آگے لکھتے ہیں "سوشلزم انیسویں صدی عیسوی کی دوسری چوتھائی کی پیداوار ہے۔ اس لئے اسلام سے اس کی مخالفت کے یہ معنی تو ہر نہیں سکتے کہ کتاب مبین قرآن نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ حدیث میں اسے ممنوع ٹھہرایا گیا ہے۔ سوشلزم کا جب وجود ہی نہ تھا تو اسے ناجائز یا ممنوع کس طرح ٹھہرایا جاتا؟ فکری تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ سوشلزم انیسویں صدی

عیسوی کی دوسری چوتھائی کی پیداوار نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پرودھن، مارکس و اینجلز اور پرنس کروپوٹکن یہ سب انیسویں صدی کے لوگ تھے، اور انہوں نے سوشلزم کے تین مختلف برانڈ (بشمول مارکس و اینجلز کے ایک برانڈ) پیش کئے۔ لیکن سوشلزم کے ایک برانڈ کا خالق افلاطون تھا جس نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "جمہوریت" میں حکمران گروہ کے لئے سوشلزم کا وہ مثالی نمونہ پیش کیا ہے جس میں اجتماعی ملکیت اتنی مکمل ہے کہ اس سے بڑھ کر مکمل ہو نہیں سکتی، وہاں تمام پیداواری وسائل و ذرائع حتیٰ کہ بیویاں تک سب کی مشترک اور اجتماعی ہیں۔

اسلام سے ماقبل ایک زمانے میں ایران کی مزدکیت بھی سوشلزم ہی کی ایک قسم تھی۔ پھر تھامس مور (۱۴۷۸ء تا ۱۵۳۵ء) نے اپنے "یوٹوپیا" میں سوشلزم ہی کا راگ الاپا تھا۔ خود مارکس کے پیرو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مارکس نے آکر "سائنٹفک سوشلزم" پیش کیا، جبکہ اس سے پہلے کے مفکرین محض شاعرانہ سوشلزم (Utopian Socialism) پیش کرتے رہے۔

تاریخ سے آنکھیں بند کر کے اگر ڈاکٹر سبزواری کی یہ انوکھی تحقیق صحیح مان بھی لی جائے کہ سوشلزم انیسویں صدی عیسوی کی دوسری چوتھائی کی پیداوار ہے، اور اس سے پہلے کسی قسم کے سوشلزم کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا تو کیا فی نفسہٖ یہ ایک دلیل بن جائے گی کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سوشلزم پیدا ہوا، لہٰذا قرآن و حدیث سوشلزم کے مخالف ہو ہی نہیں سکتے۔؟ اس "دلیل" کے بین السطور سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس گروہ کی ناکام وکالت کر رہے ہیں جس کے نزدیک نعوذ باللہ نہ تو قرآن خدا کی کتاب ہے، اور نہ آنحضورؐ خدا کے رسول تھے، ورنہ یہ تصور کس طرح ممکن ہے کہ قرآن و حدیث اپنے سے پیشتر اور ہمعصر جاہلیت کے خلاف تو ہدایت کا سرچشمہ تھے۔ لیکن مستقبل کی کسی جاہلیت کی کاٹ ان میں نہیں ملتی۔؟ پھر کیا دنیا کو یہ بتانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ چونکہ قرآن و حدیث میں سوشلزم کا نام لیکر اس کی مخالفت نہیں کی گئی لہٰذا سوشلزم جائز ٹھہرا، اور یہ کہ ایک عدد "اسلامی سوشلزم" بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔؟

سوشلزم کا مقابلہ موجودہ نظام سے کرتے ہوئے ڈاکٹر سبزواری لکھتے ہیں۔ "موجودہ نظامِ معاش جسے اسلامی بتایا جاتا ہے، انفرادی ہے۔" ان لوگوں کی ہمت کی داد دینا چاہئے کہ دن کی صاف روشنی میں اتنا بڑا بہتان بے جھجک گھڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ کوئی صحیح الدماغ شخص موجودہ نظامِ معاش کو اسلامی نہیں کہہ سکتا۔ کسے خبر نہیں کہ موجودہ نظامِ معاش برطانوی سامراج کا ورثہ ہے۔ اور اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسان کے صحت مند ارتقاء، تکمیلِ خودی اور حصولِ عظمت

کے راستے میں دراصل سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں سنگ گراں ہیں۔ دونوں ام الخبائث مادیت کی پیداوار ہیں۔ دونوں انسان کے خود ساختہ، یک رُخے اور غیر متوازن ہیں۔ اسلام کے نزدیک دونوں جاہلیت کے نمونے ہیں۔ اقبال بھی دونوں کی ہلاکت آفرینی اور انسانیت کشی کا ماتم کناں ہے۔

هر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — هر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج — درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں به علم و دین و فن آرد شکست — آں برد جاں را ز تن ناں را ز دست
غرق دیدم هر دو را در آب و گل — هر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخم دلے انداختن

غربیاں گم کرده اند افلاک را — در شکم جویند جان پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک — جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دین آں پیغمبر حق ناشناس — بر مساوات شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نه در آب و گل است

(جاوید نامہ)

ڈاکٹر سبزواری آگے چل کر لکھتے ہیں: "روزی میں سابقت تمام اخلاقی اور سماجی مفاسد کی جڑ ہے۔" یہ جھاڑو پھیر دینے والا کلیہ بناکر رکھ دینا قطعی غلط ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اخلاقی اور سماجی مفاسد کے مختلف اسباب میں سے بے قید مادی سابقت ایک سبب ہے گہری نظر سے دیکھئے تو یہ خرابی سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں میں پائی جاتی ہے۔ فرق محض یہ ہے کہ سرمایہ داری میں یہ انفرادی سطح پر پائی جاتی ہے، اور سوشلزم میں اس کا وجود زیادہ تر اجتماعی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اندر کے لئے سوشلسٹ معاشرے میں یہ خرابی اتنی نمایاں نہیں ہوتی جتنی سرمایہ دارانہ نظام میں، لیکن باہر کے لئے اس کا وجود سوشلسٹ معاشرے میں سرمایہ داری کی نسبت کسی طرح کم مفاد پرست نہیں ہوتا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد مشرقی یورپ کے چھوٹے ملکوں کی تاریخ پر نظر ڈال لیجئے، حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی، ہر موقع پر تاریخ سے آنکھیں بند کر لینے کی اگر مصلحت پرست عادت ہی پڑ چکی ہو تو بات دوسری ہے، ورنہ سرخ سامراج اور سفید سامراج

میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں

تمام اخلاقی اور سماجی مفاسد کی اصل جڑ انسان کی یہ فکر و کوشش ہے کہ وہ خدا کی ہدایت سے ہٹ کر کوئی نہ کوئی "ازم" وضع کرکے اور اس پر نظام زندگی چلائے۔ نیز خدا سے حصول ہدایت کا یہ طریقہ کبھی سود مند نہیں رہا کہ آدھے پونے پر سودا بازی کی جائے۔ یہ بات کہیں اور چل سکتی ہو تو چل سکتی ہو کہ خدا کا خدا کے حوالے اور سیزر کا سیزر کے حوالے، لیکن اسلام میں اس مذاق کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ "اسلام ہمارا دین" تو ہے لیکن طرز حکومت کے لئے ہمیں مغرب سے جمہوریت کی بھیک مانگنی ہوگی، اور معیشت میں ہدایت کے لئے سوشلزم کے سامنے جبین نیاز جھکانی پڑے گی تو بتائیے کہ کیا اسلام صرف مسجد کی چار دیواری میں بند ہونے کے لئے ہے اور کیا اس کے مکمل ہونے کا دعویٰ جھوٹا ہے۔!

ہر نظام اپنے جداگانہ اصول، اپنا علیحدہ نصب العین، اپنا الگ پروگرام، اپنا ممتاز طریق کار، اپنا منفرد مزاج اور اپنی مخصوص اصطلاحات رکھتا ہے۔ جب انسان کے خود ساختہ نظاموں کا یہ حال ہے تو کیا یہ تقدیر صرف اسلام ہی کے حصّہ میں آئی ہے کہ خدا کا آخری اور مکمل ترین ہدایت نامہ ہونے کے باوجود وہ کبھی مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے سامنے جھولی پھیلائے کبھی ہٹلر کے نازی ازم و مسولینی کے فاشزم کے آگے دست سوال دراز کرے، اور کبھی کارل مارکس کی پرولتاری آمریت و جدلی مادیت کے حضور اپنا کشکول گدائی پیش کرتا پھرے کہ اس میں اصول، نصب العین، طریق کار اور اصطلاحات کی بھیک ڈال دی جائے۔!—
سچ ہے کہ ع

غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

ظاہر ہے غلامی محض اجسام کی غلامی نہیں ہوتی بلکہ غلامی کی اصل جڑ وہ ہے جو اذہان و قلوب میں پیوست ہوتی ہے۔ یہ جڑ اتنی غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتی ہے کہ خود وہ افراد اور گروہ جن کے اندر یہ پائی جاتی ہے، اس کا کوئی شعور نہیں رکھتے بلکہ اس ایک مرض کی بدولت بے شمار دوسری نفسیاتی، اخلاقی اور روحانی بیماریوں کی یلغار کے درمیان وہ لوگ اس گھمنڈ میں مگن رہتے ہیں کہ "روشن خیالی" اور "ترقی پسندی" کے واحد اجارہ دار وہی ہیں اور باقی سب "رجعت پسندی" کی گالی کے مستحق ہیں۔

(دوسری قسط اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں)

وحید الدین خان

کا وجود اور اُس سے ہمارا تعلق

اس کائنات کا ایک خدا ہے جو اس کا خالق اور مالک ہے۔ خدا نے ایک خاص سکیم کے تحت ہم کو پیدا کیا ہے، جس کا علم وہ اپنے مخصوص اور منتخب بندوں کے ذریعہ ہم تک بھیجتا ہے، جن کو ہم رسول کہتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلے کے آخری رسول ہیں اور اب تمام دنیا کو آپ کی پیروی کرنی ہے۔ جو شخص آپ کی دعوت کو پائے اور پھر اسکو قبول نہ کرے وہ صرف آپ ہی کا انکار نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت خدا کے تمام نبیوں کا انکار کر دیتا ہے، ایسا شخص خدا کا وفادار نہیں بلکہ اس کا باغی ہے اور خدا کی رحمتوں میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ ہے مختصر طور پر اسلام کا تعارف، جس کی مجھے اس مضمون میں تشریح کرنی ہے۔

خدا کا وجود: سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ بعض لوگ اس بات کو نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سارا کارخانہ محض ایک اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگیا ہے، اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔

ہکسلے کے الفاظ میں: چھ بندر ایک ایک ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جائیں اور اربوں اور کھربوں سال تک الل ٹپ طریقے سے ان کو پیٹتے رہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کے سیاہ کئے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں کسی صفحے پر شیکسپیئر کی ایک نظم نکل آئے۔ اسی طرح اربوں اور کھربوں سال تک مادے کے اندھے عمل کے دوران میں بالکل اتفاق سے یہ دنیا بن گئی ہے۔

یہ جواب جس نے صدیوں سے بہت سے لوگوں کو فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ

در اصل کوئی جواب نہیں ہے۔ بلکہ محض چند الفاظ کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ اتفاق یا حادثہ بذات خود کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر جو چیز خود ہی اپنا وجود نہ رکھتی ہو وہ کسی دوسری چیز کو وجود میں لانے کا سبب کس طرح بن سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ کائنات کی یہ تشریح کائنات کے اوپر بالکل چسپاں نہیں ہوتی، یہ محض ایک بنیادی دعویٰ ہے۔ جو ذہنوں میں گھڑ لیا گیا ہے۔ اور کائنات کی حقیقی ساخت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس خدا کا تصور کائنات کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ وہ خود کائنات کے اندر سے بول رہا ہے۔

کائنات اتنی پر حکمت، وہ اتنی منظم ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگئی ہو۔ زمین پر جاندار چیزوں کی بقا کے لئے جو حالات ضروری ہیں، وہ نہایت مکمل طور پر یہاں موجود ہیں۔ کیا محض اتفاق کے نتیجے میں اتنے عمدہ حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔

زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لٹو کی مانند گھومتی ہے اگر زمین کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو ہمارے دن اور رات اب کے دن اور رات سے دس گنا زیادہ لمبے ہوتے۔ زمین کی تمام ہریالی اور ہماری بہترین فصلیں سو گھنٹے کی مسلسل دھوپ میں جھلس جاتیں اور جو بچ رہتیں وہ بھی رات میں سردی کی نذر ہو جاتیں۔

سورج جو ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے، اپنی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہیٹ سے دہک رہا ہے۔ یہ حرارت اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے پہاڑ بھی اس کے سامنے جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ مگر وہ ہماری زمین سے اتنے مناسب فاصلے پر ہے کہ یہ "دائمی انگیٹھی" ہمیں ہماری ضرورت سے ذرہ بھر زیادہ گرمی نہ دے سکے۔ اگر سورج دگنے فاصلہ پر چلا جاتے تو زمین پر اتنی سردی پیدا ہوگی کہ ہم سب لوگ جم کر برف ہو جائیں گے اور اگر وہ آدھے فاصلے پر آجائے تو زمین پر اتنی حرارت پیدا ہوگی کہ تمام جاندار اور تمام پودے جل بھن کر خاک ہو جائیں گے۔

زمین کا کرہ فضا میں سیدھا کھڑا نہیں ہے، بلکہ ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتا ہوا ایک طرف کو جھکا ہوا ہے۔ یہ جھکاؤ نہ ہوتا تو سمندر سے اٹھتے ہوئے بخارات سیدھے شمال یا جنوب کو چلے جاتے۔ اور براعظم برف سے ڈھکے رہتے۔

چاند ہم سے تقریباً ڈھائی لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بجائے اگر وہ صرف ایک لاکھ میل دور ہوتا تو سمندروں میں مدوجزر کی لہریں اتنی بلند ہوتیں کہ تمام کرۂ ارض دن میں دو بار پانی میں ڈوب جاتا اور بڑے بڑے پہاڑ موجوں کے ٹکرانے سے گھس کر ختم ہو جاتے۔

یہ ہماری کائنات کے چند نہایت معمولی اور بالکل سادہ واقعات ہیں۔ ان کے سوا بیشمار ایسے واقعات ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری زمین پر ان کا اجتماع محض اتفاقی طور پر نہیں ہو سکتا اور نہ محض اتفاق انہیں باقی رکھ سکتا ہے۔ یقیناً کوئی ہے جو ان واقعات کو وجود میں لایا ہے، اور ان کو اس قدر منظم طریقہ پر مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے۔ کائنات اتنی مربوط اور منظم ہے کہ جب بھی ہم اس کے کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو در حقیقت ہم اس کو محدود کر دیتے ہیں، کائنات کے ایک ایک جزو کے اندر اتنی حکمتیں ہیں کہ جب بھی ہم اس کی کسی حکمت کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم اسکو ایک کمتر درجے کی چیز بناکر پیش کر رہے ہیں، ایسی ایک کائنات کو خدا کی مخلوق ماننا اگر کسی کو خلاف عقل معلوم ہوتا ہے تو اس سے زیادہ خلاف عقل بات یہ ہے کہ اس کائنات کو بے خدا فرض کر لیا جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر خدا نے سب چیزیں پیدا کی ہیں تو خود خدا کو کس نے پیدا کیا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر حال میں پیدا ہوتا ہے، خواہ ہم خدا کو مانیں یا نہ مانیں، ہم دو میں سے کسی ایک چیز کو بلا سبب ماننے پر مجبور ہیں، یا خدا کو بے سبب مانیں، یا کائنات کو۔ ہمارے سامنے ایک عظیم کائنات ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں، جس کو ہم محسوس کرتے ہیں۔ مجبور ہیں کہ اس کائنات کے وجود کو تسلیم کریں۔ ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ پھر ہم یا تو یہ کہیں کہ کائنات خود سے وجود میں آگئی ہے یا یہ کہیں کہ کوئی اور ہستی ہے جس نے اس کو بنایا ہے، دونوں صورتوں میں ہم کسی نہ کسی کو بلا سبب تسلیم کریں گے۔ پھر کیوں نہ ہم خدا کو بلا سبب مان لیں جس کو ماننے کی صورت میں ہمارے تمام سوالات کا جواب مل جاتا ہے۔ جب کہ کائنات کو بلا سبب ماننے کی شکل میں کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ وہ تمام سوالات جو اس مسئلے کے اردگرد پیدا ہوتے ہیں وہ سب کے سب بدستور باقی رہتے ہیں ــــ

بعض لوگوں نے فلسفیانہ موشگافی کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ سب کچھ صرف ہمارا وہم ہے۔ مگر ایک شخص جب یہ بات کہتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ کائنات کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے۔ آخر یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا کہ کائنات کوئی چیز ہے یا نہیں۔ سوال کا پیدا ہونا خود ظاہر کرتا ہے کہ کوئی چیز ہے جس کے بارے میں سوال درپیش ہے، اور کوئی ہے جس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہورہا ہے۔ اس طرح فلسفۂ تشکیک بیک وقت انسان اور کائنات دونوں کو تسلیم کر لیتا ہے۔

خدا کے ساتھ ہمارا تعلق خدا کو ماننے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ہمارا تعلق کیا ہے۔ پچاس سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر خدا کا کوئی وجود ہے بھی تو اس سے ہمارا تعلق نہیں ہو سکتا، مگر جدید کوانٹم نظریہ کے ذریعہ خود سائنس نے اسکی تردید کر دی ہے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات ایک مشین ہے جو ایک مرتبہ حرکت دینے کے بعد مسلسل چلی جا رہی ہے اس نظریے پر سائنس دانوں کو اس قدر یقین تھا کہ انیسویں صدی کے آخر میں برلن کے پروفیسر ماکس پلانک نے جب روشنی کے متعلق بعض ایسی تشریحات پیش کیں جو کائنات کے مشین ہونے کو غلط ثابت کر رہی تھیں تو اس پر سخت تنقیدیں ہونے لگیں، اور اس کا مذاق اڑایا گیا، مگر اس نظریے کو زبردست کامیابی ہوئی اور بالآخر وہ ترقی کر کے جدید کوانٹم نظریہ کی صورت میں آج علم طبیعیات کے اہم اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے [1]

پلانک کا نظریہ اپنی ابتدائی شکل میں یہ تھا کہ قدرت چھلانگوں کے ذریعہ حرکت کرتی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں آئن سٹائن نے اس بات کی وضاحت کی کہ پلانک کا نظریہ صرف عدم تسلسل ثابت نہیں کرتا بلکہ زیادہ انقلاب انگیز نتائج کا حامل ہے۔ یہ اصول تعلیل کو اس کے بلند مقام سے معزول کر رہا ہے۔ جو اس سے پہلے عام فطرت کے تمام واقعات کا رہنما سمجھا جاتا تھا قدیم سائنس نے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو سبب اور نتیجے کی مسلسل کڑیوں کے مطابق اس کے آغاز سے لے کر انجام تک معین ہو چکا ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ محض ناقص مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ خدا کو اگر ماننا ہی ہے تو سبب اوّل کے طور پر اسے مان لو ورنہ آج کائنات کو خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب معلوم ہوا کہ کائنات صرف حرکت اوّل کے لئے کسی محرک کی محتاج نہیں تھی، بلکہ وہ ہر آن حرکت دئے جانے کی محتاج ہے۔ کوانٹم نظریہ دوسرے لفظوں میں یہ بتاتا ہے کہ کائنات ایک خود چلا مشین نہیں ہے بلکہ وہ ایسی مشین ہے جس کو ہر آن چلایا جا رہا ہے۔ ایک حی و قیوم ہستی کا مسلسل فیضان ہے جو اس کو باقی رکھے ہوئے ہے اگر ایک لمحے کے لئے بھی وہ اپنا فیضان واپس لے لے تو ساری کائنات اس طرح ختم ہو جائے گی، جیسے سینما گھر میں بجلی کا سلسلہ ٹوٹنے سے پردہ سیمیں کے سارے واقعات غائب ہو جاتے ہیں۔ اور ناظرین کے سامنے ایک سفید کپڑے کے سوا اور

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحات ۱۲ - ۲۰

کچھ نہیں رہتا۔ گویا اس دنیا کا ہر ذرہ اپنے وجود اور حرکت کے لئے ہر آن قادر مطلق سے اجازت طلب کرتا ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنی ہستی کو قائم نہیں رکھ سکتا۔

کائنات کے ساتھ خدا کا یہ تعلق خود بتاتا ہے کہ انسان کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہونا چاہئے ظاہر ہے کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے۔ جو ہمارے لئے تمام موزوں ترین حالات کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے اور ان کو ہمارے حق میں ہموار کرتا رہتا ہے جو ہر آن ہماری پرورش کر رہا ہے۔ اس کا ہمارے اوپر یہ لازمی حق ہے کہ ہم اپنے مقابلے میں اسکی برتر حیثیت کو تسلیم کریں۔ اور بالکل اس کے بندے بن جائیں۔ انسان جن قدروں سے واقف ہے، ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین قدر یہ ہے کہ احسان کرنے والے کا احسان مانا جائے۔ محسن خواہ اپنی طرف سے نہ دبائے مگر جو احسان مند ہے وہ خود اس کے سامنے دب جاتا ہے۔ اس کے آگے اس کو نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا خدا ہونا خود ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کی خدائی کو تسلیم کریں اور اسکی مرضی پوری کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔ بندے کی طرف سے خدا کی اطاعت کے لئے اس کے سوا کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ یہ صرف حق شناسی کا تقاضا نہیں ہے کہ ہم خدا کی خدائی اور اس کے مقابلے میں اپنی بندگی کو تسلیم کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی راہ بھی نہیں ہے۔ ہماری زندگی کے سارے مسائل خدا سے متعلق ہیں۔ ہم کو جو کچھ ملے گا، اسی سے ملے گا۔ اس کے سوا کوئی اور ہمیں کچھ نہیں دے سکتا۔ ہم اس کائنات میں اس قدر عاجز اور مجبور ہیں کہ خدا کی مدد کے بغیر ایک لمحہ کے لئے اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتے۔ پھر خدا کو چھوڑ کر آخر ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔

ذرا غور کیجئے یہ ہندوستان کی شمالی سرحد پر ہمالیہ پہاڑ کا ڈھائی ہزار میل لمبا سلسلہ کس نے قائم کیا ہے۔ ہم نے یا خدا نے۔؟ اگر ہمالیہ پہاڑ نہ ہوتا تو خلیج بنگال سے اٹھنے والی جنوب مشرقی ہوائیں جو ہر سال ہمارے لئے بارش لاتی ہیں۔ بالکل پانی نہ برسائیں اور سیدھی روس کی طرف نکل جاتیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام شمالی ہندوستان منگولیا کی طرح ریگستان ہوتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ سورج اپنی غیر معمولی کشش سے ہماری زمین کو کھینچ رہا ہے، اور زمین ایک مرکز گریز قوت کے ذریعہ اس کی طرف کھنچ جانے سے اپنے آپ کو روکتی ہے اور اسطرح وہ سورج سے دور رہ کر فضا کے اندر اپنا وجود باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر کسی دن زمین کی یہ

قوت ختم ہو جائے تو وہ تقریباً چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے گی، اور چند ہفتوں میں سورج کے اندر اس طرح جا گرے گی جیسے کسی بہت بڑے الاؤ کے اندر کوئی تنکا گر جائے۔ ظاہر ہے کہ زمین کو یہ طاقت ہم نے نہیں دی ہے بلکہ اس خدا نے دی ہے جس نے زمین کو پیدا کیا ہے۔

کائنات کے جس حصے میں ہم رہتے ہیں اس کا نام نظام شمسی ہے، اگر آپ کسی دور دراز مقام پر بیٹھ کر اس نظام کا مشاہدہ کر سکیں تو آپ دیکھیں گے کہ لامتناہی خلا کے اندر ایک آگ کا گولا بھڑک رہا ہے جو ہماری زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے جس سے اتنے بڑے بڑے شعلے نکلتے ہیں جو کئی کئی لاکھ میل تک فضا میں اڑتے چلے جاتے ہیں، اسی کا نام سورج ہے، پھر آپ ان سیاروں کو دیکھیں گے جو سورج کے چاروں طرف اربوں میل کے دائرے میں پروانوں کی طرح چکر لگا رہے ہیں۔ ان دوڑتی ہوئی دنیاؤں میں ہماری زمین نسبتاً ایک چھوٹی دنیا ہے جس کی گولائی تقریباً پچیس ہزار میل ہے۔ یہ ہمارا نظام شمسی ہے جو بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے، مگر کائنات کی وسعت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کائنات میں اتنے بڑے بڑے ستارے ہیں جن کے اوپر ہمارا پورا نظام شمسی رکھا جا سکتا ہے۔ اس بے انتہا وسیع اور عظیم کائنات میں ہماری زمین فضا میں اڑنے والے ایک ذرے سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے کیڑے کی مانند اس ذرے سے چپٹے ہوئے ہیں اور خلا میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں مصروف ہیں۔

یہ کائنات کے اندر ہماری حیثیت ہے، غور کیجئے انسان کس درجہ حقیر ہے اور خارجی طاقتوں کے مقابلے میں کس قدر عاجز ہے۔ پھر جب ہماری حیثیت یہ ہے تو ہم خالق کائنات سے مدد طلب کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں جس طرح ایک چھوٹے بچے کی ساری کائنات اس کے ماں باپ ہوتے ہیں، اسکی زندگی، اسکی ضرورتوں کی تکمیل اور اس کے مستقبل کا انحصار بالکل اس کے والدین کے اوپر ہوتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ انسان اپنے رب کا محتاج ہے۔ ہم خدا کی مدد اور اس کی رہنمائی کے بغیر اپنے لئے کسی چیز کا تصور نہیں کر سکتے وہی ہمارا سہارا ہے اور اسی کی طرف ہمیں دوڑنا چاہئے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان خدا کی رہنمائی اور اس کی مدد کا محتاج ہے خدا کی طرف سے انسان کی یہی حیثیت قرار پائی ہے۔ اور خود انسان کے لئے بھی اس کے سوا

چارہ نہیں ہے کہ وہ خدا سے اپنے لئے مدد اور رہنمائی کی درخواست کرے۔

معرفت کا حصول | یہاں پہنچ کر جب ہم اپنے گرد و پیش کی دنیا پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق کی طرف سے اپنی مخلوقات کے لئے مدد اور رہنمائی کا ایک مستقل عمل جاری ہے۔ جس کو جس چیز کی ضرورت ہے اس کو وہ چیز پہنچائی جا رہی ہے ایک معمولی بھڑ کی مثال لیجئے۔

بھڑ کا طریقہ ہے کہ وہ انڈے دینے سے پہلے زمین میں ایک گڑھا کھودتی ہے، اور ایک ٹڈے کو قابو میں کر کے اس کو گڑھے میں رکھ دیتی ہے۔ ایسا کرتے وقت وہ نہایت صحت کے ساتھ ٹڈے کے اس خاص عصبی مقام پر ڈنگ مارتی ہے جس سے ٹڈا مرتا نہیں صرف بے ہوش رہتا ہے اور تازہ گوشت کا ذخیرہ بن جاتا ہے۔ بھڑ اب اس بیہوش ٹڈے کے اردگرد انڈے دیتی ہے تاکہ انڈوں سے نکل کر بچے اس زندہ ٹڈے کو دھیرے دھیرے کھاتے رہیں۔ کیونکہ مردہ گوشت ان بچوں کے لئے مہلک ہے۔ اتنا انتظام کر لینے کے بعد بھڑ وہاں سے اڑ جاتی ہے اور پھر کبھی آ کر اپنے بچوں کو نہیں دیکھتی۔ مگر اس کے باوجود بھڑ کا یہ بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو وہ بھی ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے۔ ساری بھڑیں اس کام کو زندگی میں ایک بار اور پہلی بار بالکل ٹھیک ٹھیک انجام دیتی ہیں، غور کیجئے کہ وہ کون ہے جو اس بھڑ کے بچے کو سکھاتا ہے کہ اپنی نسل کو جاری رکھنے کے لئے وہ بھی آئندہ وہی عمل کرے جو اس کے ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ حالانکہ اپنے ماں باپ کے عمل کو اس نے کبھی نہیں دیکھا۔

دوسری مثال اس لمبی مچھلی کی ہے جسے انگریزی میں ایل کہتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب جاندار اپنی زندگی کی جوانی میں ہر جگہ کے آبی مرکزوں اور ندیوں سے نکل نکل کر جزیرہ برمودا کے پاس سمندر کے ایک گہرے تہہ میں جاتے ہیں۔ یورپ کی ایلیں اٹلانٹک میں تین ہزار میل کا راستہ طے کر کے یہاں پہنچتی ہیں۔ وہیں یہ سب مچھلیاں بچے دے کر مر جاتی ہیں۔ یہ بچے جب آنکھ کھولتے ہیں تو اپنے آپ کو ایک سنسان آبی مرکز میں پڑا ہوا پاتے ہیں۔ ان کے پاس بظاہر معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا، پھر بھی وہ وہاں سے لوٹ کر دوبارہ انہیں کناروں پر آ لگتے ہیں جہاں سے ان کے والدین چلے گئے تھے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے اپنے

لہ اسی حیرت انگیز عمل کو دیکھ کر فلسفی برگساں نے کہا تھا۔ "کیا بھڑ نے کسی مدرسے میں ماہر عضویات کی تعلیم حاصل کی ہے؟"

ماں باپ والی ندیوں، جھیلوں اور آبی مرکزوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی آبی مرکز سے ایلیں ہمیشہ کے لئے غائب نہیں ہو جاتیں۔ اور یہ سب کچھ اسطرح ہوتا ہے کہ امریکہ کی کوئی ایل یورپ میں نہیں ملتی اور نہ یورپ کی کوئی ایل امریکہ کے سمندروں میں پائی جاتی ہے۔ آمدورفت کی یہ معلومات نہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔

یہ کام وحی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ وحی پیغام رسانی کے اس مخفی سلسلے کو کہتے ہیں جو خدا اور اس کی مخلوقات کے درمیان جاری ہے۔ کوئی مخلوق زندگی گذارنے کیلئے کیا کرے اور خالق کائنات نے اپنی مجموعی سکیم کے اندر اس کے ذمے جو فرض عائد کیا ہے اس کو کس طرح انجام دے، اسی کو بتانے کا نام وحی ہے۔ اس وحی کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کا تعلق انسان کے سوا دوسری مخلوقات سے ہے، اور دوسری وہ جسکا تعلق انسان سے ہے۔ انسان کے سوا جتنی زندہ مخلوقات اس زمین پر پائی جاتی ہے، وہ سب کی سب ارادے سے خالی ہے۔ ان کا کام کسی سوچے سمجھے فیصلے اور ارادے کے تحت نہیں ہوتا بلکہ ایک غیر شعوری قسم کے طبعی میلان کے تحت ہوتا ہے جس کو ہم جبلت کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک طرح کی زندہ مشینیں ہیں جو محدود دائرے میں اپنا متعین عمل کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کے جانداروں کے لئے ترک و اختیار کا کوئی سوال نہیں۔ اس لئے ان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں نہیں آتی بلکہ جبلت یا عادت فطری کی شکل میں آتی ہے۔ ان کی ساخت اس طرز کی بنا دی جاتی ہے کہ وہ ایک مخصوص کام کو بار بار دہراتے رہیں۔ مگر انسان ایسی مخلوق ہے جو فیصلے کی قوت رکھتا ہے۔ وہ اپنے ارادے سے کسی کام کو کرتا ہے اور کسی کام کو نہیں کرتا۔ وہ ایک کام کرنا شروع کرتا ہے پھر اسے بالقصد چھوڑ دیتا ہے اور ایک کام نہیں کرتا اور بعد کو اسے کرنے لگتا ہے اس سے ظاہر ہوا کہ انسان بھی اگرچہ اسی طرح خدا کا بندہ ہے جسطرح اسکی دوسری مخلوقات، مگر اسکو حالت امتحان میں رکھا گیا ہے جو کام دوسری مخلوقات سے عادت فطری کے تحت لیا جاتا ہے انسان کو وہی کام اپنے فیصلے اور ارادے سے کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کے پاس وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں عالم حیوانات پر وحی انکی فطرت میں پیوست کر دی گئی ہے۔ اور انسان کی وحی خارج سے اسے ۔ جاتی ہے۔ عالم حیوانات کو کیا کرنا ہے اسکا علم وہ پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لیکر آتے ہیں اس کے برعکس انسان جب عقل و ہوش کی عمر کو پہنچتا ہے تو خدا کیطرف سے پکار کر اسے بتایا جاتا ہے کہ تم کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ اس پیغام رسانی کا ذریعہ رسالت ہے۔ جو شخص یہ پیغام لیکر آتا ہے اسکو ہم رسول کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے ایک نیک بندے کو چن لیتا ہے اور اسکے قلب پر اپنا پیغام اتارتا ہے اسطرح وہ شخص براہ راست خدا سے اسکی مرضی کا علم حاصل کر کے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ رسول گویا وہ درمیانی کڑی ہے جو بندے کو اس کے خدا سے جوڑتی ہے

■■

مولانا تھانوی کی مجلس میں

معاشرت سے متعلق حکام کی باتیں

کثرتِ مکاتبت کا مقصد | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ میں بکثرت مکاتبت کا جو مشورہ دیا کرتا ہوں اس سے یہ مقصود نہیں کہ دل بنا دیا جاتا ہے، بلکہ وہ بڑا ذریعہ ہے مناسبت کا جو شرطِ اعظم ہے نفع کی۔

بے عملی اور ترقی جمع نہیں ہو سکتیں | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ لوگ میرے مواخذات کو دیکھ کر کہتے ہوں گے کہ کس قصائی سے پالا پڑا۔ اور میں اُن کی بدتمیزی کو دیکھ کر کہتا ہوں کہ کن بیلوں سے پالا پڑا۔ بیل و قصائی میں ایک تقابل بھی ہے، بات یہ ہے طبیعتوں میں آزادی کی زہریلی ہوا گھسی ہوئی ہے، چاہتے ہیں کہ ہو تو جائیں سب کچھ مگر نہ تو ہم کو کوئی کچھ کہے اور نہ کچھ کرنا پڑے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کسی کو اولاد کی تو تمنا ہو مگر نہ رشتہ نہ کہیں آنا جانا پڑے نہ نکاح ہو اور اولاد ہو جاوے۔ ع

این خیال ست و محال ست و جنوں

طریقہ اصلاح اور طالب کی حالت | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا یہ مقولہ سنا ہے کہ جس کا پیر تُند نہ ہو اس مرید کی اصلاح ہو نہیں سکتی۔ مولانا احمد حسن صاحب امروہی بڑے نازک مزاج تھے، عالی خاندان تھے۔ دیوبند پڑھنے آئے تھے مولانا نے دیکھا کہ اُن میں صلاحیت ہے عالی دماغ ہیں، ادب تربیت بھی ساتھ ساتھ شروع فرما دی، حضرت اُن کو چاہتے بہت تھے مگر اصلاح میں ذرا رعایت نہ فرماتے تھے کوئی جولاہا آتا دعوت کرنے فرماتے کہ ایک لڑکا بھی ساتھ ہوگا وہ خوشی سے قبول کر لیتے کہیں چٹائی پر بیٹھ کر اور کہیں کمبل پر بیٹھ کر روٹی کھانی پڑتی اس میں ترک

تکلف کی عادت ڈالنا مقصود تھا ایک گاؤں والا ایک گاڑھے کا تھان حضرت مولانا کے واسطے لایا حضرت نے درزی کو بلا کر فرمایا کہ اس سے اس لڑکے کے واسطے کرتہ پاجامہ قطع کر کے سی دو ان کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے بندوق ماری ہو۔ مگر پھر پہننا پڑا اور سب تکلف طبیعت سے رخصت ہوا گو لطافت اس وقت بھی وہی لطافت تو فطری چیز ہے مگر کبر کا نام ونشان نہ تھا غرض اصلاح اس طرح ہوتی ہے اور گو اس متشددانہ طریق سے اصلاح کرنے کی ہمارے بزرگوں میں کثرت نہ تھی مگر اس وقت اسکی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ پہلے طالبوں کی طبیعتوں میں سلامتی تھی اور اب نہیں، فرق کی وجہ یہ ہے۔

فن سے ناواقف کو اعتراض کا حق نہیں | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ حضرت حاجی صاحبؒ سے کوئی شخص فن کو بے سمجھے سوال کرتا تو فرماتے کہ بھائی یہ قیل و قال کے لئے مدرسہ نہیں۔

راحت رسانی ادب وتعظیم سے ضروری ہے | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ میں تعظیم وتکریم کی تو زیادہ رعایت کرتا نہیں البتہ راحت کا خاص اہتمام کرتا ہوں، آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میں نے آج تک دونوں گھروں میں اس کی فرمائش نہیں کی کہ فلاں چیز پکا لو یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید انتظام میں کوئی الجھن ہو البتہ خود ان کی پوچھنے پر بتلا دیتا ہوں وہ بھی محض ان کی دلجوئی کی وجہ سے کہ یہ گمان نہ ہو کہ ہم سے اجنبیت برتتے ہیں، پھر وہ بتلانا بھی اس صورت سے ہوتا ہے کہ میں ان سے کہتا ہوں کہ تم بسہولت جو پکا سکتی ہو اس میں دو چار چیزوں کے نام لو وہ نام لیتی ہیں تو میں ان میں سے ایک کو انتخاب کر دیتا ہوں اور اب تو اس کی پرواہ ہی نہیں کہ دوسروں کو کوئی تکلیف نہ ہو تعظیم وتکریم کا تو اہتمام کرتے ہیں مگر راحت کا کوئی سامان نہیں کرتا۔

شریعت کا حاصل راحت دارین ہے | ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ انا للہ کے معنی ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کو ہم میں ہر تصرف کا حق ہے اور انا الیہ راجعون۔ کا حاصل یہ ہے جو شخص مرا ہے اور جس پر رو رہے ہیں وہ اور ہم سب وہاں ہی جائیں گے، وہاں ہی مل لیں گے بس ان دونوں جملوں کا حاصل یہ ہوا کہ جب تم ان دونوں مضمون کا مراقبہ کرو گے تو تمہاری کلفت جاتی رہے گی، راحت ہوگی اور تعزیت کے بھی یہی معنی ہیں کہ رنج والے کو تسلی دی جائے سو یہ جو آجکل عرف میں رواج ہے کہ جا کر کہتے ہیں کہ ہائے ایسی عمر نہ تھی، ہائے چھوٹے چھوٹے بچے رہ گئے وغیرہ وغیرہ یہ تعزیت نہیں یہ تو رنج کو بڑھانا ہے، اس سے تو تعزیت کو نہ جاتے تو اچھا تھا۔ معاشرت کے باب میں شریعت کی جتنی تعلیمات ہیں سب کا حاصل یہ ہے کہ

دوسرے کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ حاجی محمد یوسف صاحب رنگونی نے مجھ سے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ مولانا کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں بھی راحت سے رہو اور وہاں بھی راحت سے رہو فرمایا کہ حاجی محمد یوسف صاحب نے ٹھیک کہا، شریعت کی تعلیم کا یہی حاصل ہے کہ یہاں بھی راحت سے رہو وہاں بھی راحت سے رہو۔ اب دیکھ لیجئے دعوت یہی ہے یہ محبت اور خلوص کی بنا پر ہوتی ہے مگر اصول چھوڑ دینے کی بدولت کس قدر اس میں تکلیف ہوتی ہے۔

آداب مجلس | ایک صاحب کو مجلس میں بے طریقہ بیٹھنے پر تنبیہ فرماتے ہوئے فرمایا کہ مقصوداً بیٹھنے اور عرض کے لئے بیٹھنے میں فرق ہوتا ہے صاحب عرض تو ایسا بیٹھتا ہے جیسا اکثاؤ پر لیے اور مقصوداً بیٹھنے کی ہیئت میں اطمینان اور سکون ہوتا ہے اور عرض والوں کی صورت بنا کر بیٹھنے سے قلب پر بار ہوتا ہے اور اگر کسی غرض سے بیٹھے ہو تو اس عرض کو فوراً ظاہر کر دو تاکہ گرانی دفع ہو۔

تہجد کے متعلق سوال | فرمایا کہ ایک صاحب کا خط آیا ہے، لکھا ہے کہ تہجد کے وقت کبھی آنکھ کھلتی ہے اور کبھی نہیں میں نے لکھ دیا کہ پھر دینی مرض کیا ہے۔

اسلامی اور غیر اسلامی تہذیب میں فرق | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ میرے یہاں ایک یہ بھی مستقل تعلیم ہے کہ بات صاف کہو، مجھے آجکل کی تہذیب سے سخت نفرت ہے، جیسے عام محاورہ ہو گیا ہے، کیا ایسا ہو سکتا ہے، حالانکہ استفہام مقصود نہیں ہوتا یہاں ایک صاحب مقیم تھے وہ کسی کو اسٹیشن پہنچانے کیلئے جانا چاہتے تھے، مجھ سے اجازت لینے آئے۔ سیدھی بات یہ تھی کہ میں اسٹیشن جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ مگر اس کی بجائے یوں فرماتے ہیں۔ "کیا میں اسٹیشن جا سکتا ہوں" میں نے کہا کہ کیوں نہیں جا سکتے، خدا نے پاؤں دیے چلنے کو، آنکھ دی دیکھنے کو، قوت ارادیہ دی ارادہ کرنے کو، ارادہ کیجئے اور تشریف لے جائیے۔ چلنا شروع کیجئے پہنچ جاؤ گے۔ کیا خرافات ہے اور کیا مہمل بات ہے۔ غالباً یہ عیسائیوں سے لیا ہے اور ان میں یہ کوئی نئی بات نہیں اور نہ نیا محاورہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: هل یستطیع ربك ان ینزل علینا مائدۃ من السماء۔ ان عیسائیوں ہی سے مسلمانوں نے یہ محاورہ سیکھ لیا ہے۔ دوسروں کی نقالی کرنا تو اس وقت مسلمانوں کیلئے باعث فخر ہو گیا ہے، ہونا تو یوں چاہئے تھا کہ دوسرے لوگ ان کی وضع اختیار کرتے مگر انہوں نے سب سے پہلے پیش قدمی کی اور دوسروں کی وضع اور طرز اختیار کر لیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تجدید تصوف | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آجکل لوگ صرف نفلیں اور وظائف کے پڑھ لینے

کو انتہائی کمال سمجھتے ہیں حالانکہ یہ کوئی کمال کی چیزیں نہیں۔ ہاں ثواب کی چیزیں ہیں جو کمال پر موقوف نہیں، کمال پیدا ہوتا ہے اصلاح کے بعد اور اصلاح کا ہونا عادۃً موقوف ہے صحبت کامل پر مگر نری صحبت بھی کارآمد نہیں جب تک کہ اعمال مامور بہا کا اہتمام نہ ہو اور یہی اعمال اصل سلوک ہیں بدون ان کے اختیار کئے ہوئے کوئی شخص منزل مقصود تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا اگرچہ وہ آسمان پر پرواز کرنے لگے، یا دریا پر بدون کشتی اور جہاز کے چلنے لگے، حقیقت یہ ہے، مگر آجکل جاہل صوفیوں نے لوگوں کی راہ ماری اور گمراہ کیا ہے، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب طریق بالکل زندہ ہو گیا، مدتوں کے بعد یہ دن نصیب ہوا، اور یہ میں فخر سے نہیں کہتا بلکہ بطور نعمت کے عرض کر رہا ہوں، وہ جس سے چاہے اپنا کام لے سکتے ہیں طریق سے لوگوں کو اجنبیت اور وحشت ہو چکی تھی وہ اس کو دین سے خارج سمجھ چکے تھے، اب بحمد اللہ طریق کی تکمیل ہو گئی۔

ابن تیمیہ اور ابن القیم | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ابن تیمیہ اور ابن القیم باہم استاد شاگرد ہیں، مگر غصیلے بہت ہیں، باقی ہیں ذہین، اور سلطان القلم، بہت تیز چلتے ہیں، موٹر سے بھی زیادہ، پھر نہیں دیکھتے کہ سڑک میں بچہ ہے یا جانور، بس اڑے چلے جاتے ہیں، اپنی ہی کہتے ہیں، دوسرے کی نہیں سنتے، مگر یہ عرض شان تحقیق نہیں۔

حضرت حافظ کے متعلق رائے | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ حافظ شیرازیؒ رند مشہور ہیں، میں بھی پہلے یہ سمجھتا تھا کہ آزاد ہوں گے مگر میں نے ایک کتاب دیکھی حیات حافظ اس میں ان کی سوانح ہے اس سے معلوم ہوا کہ مفسر ہیں، کشاف کے محشی ہیں، طلبہ تفسیر پڑھنے ان کے پاس آتے تھے، عالمانہ وضع میں رہتے تھے، دیوان میں بہت سے مسائل ہیں اصولیہ کلامیہ ہیں۔ ایک مولوی صاحب ان کے معتقد نہیں تھے میں نے بھی معتقد بنانے کا اہتمام نہیں کیا، کیونکہ کسی امتی کا معتقد ہونا فرض و واجب نہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اسی طرح رہنے دو، اہتمام تو ضروری چیز کا کرنا چاہیئے۔ البتہ گستاخی کرنا برا ہے۔

بزرگوں کی بات میں اثر ہوتا ہے | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ بزرگوں کی معمولی باتوں میں بھی برکت ہوتی ہے، حتیٰ کہ اگر وہ کھانے پینے کی چیزوں کا ذکر بھی کریں تو اس میں بھی ایک خاص برکت ہوتی ہے۔ علاوہ برکت کے اس میں کشش بھی ہوتی ہے۔ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے پڑھ کر آئے تھے، وعظ کہا، بہت زور لگائے سامعین پر کچھ بھی اثر نہ ہوا اس کے بعد حضرت منبر پر بیٹھے اور کچھ بیان بھی نہیں کیا صرف یہی فرمایا کہ رات ہم نے سحری کھانے کیلئے دودھ رکھا تھا لیکن بلی پی گئی، حق جل شانہٗ کا ارادہ غالب رہتا ہے، توحید کا بیان کرنا مقصود تھا، یہ کہنا تھا کہ تمام مجلس لوٹ پوٹ ہو گئی، تڑپ گئی، اب بتلایئے کون سا ایسا عالی مضمون تھا۔ ان حضرات کے اقوال افعال سب میں نور ہوتا ہے۔

مالی جرمانہ کی صورت | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر مالی جرمانہ کرے تو اسکی جائز صورت یہ ہے کہ اسکو محفوظ رکھے اور پھر اسکو واپس کر دے تصرف کیلئے اسکا رکھنا جائز نہیں کیسی حکمت کی بات ہے۔

الفت سے تکلف نہیں رہتا | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ جس قدر کسی کے ساتھ تعلق زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اسکی ظاہری خاطرداری میں کمی ہوتی جاتی ہے مگر آجکل لوگ اس کے عکس کے منتظر رہتے ہیں جو سخت غلطی ہے میرے یہاں یہی ہے کہ جب بے تکلفی ہوگئی تو اب کیسی مدارات اور کیسی خاطر، الفت کا مقتضا تو یہی ہے کہ تکلف نہ رہے۔

اسلام کسی کا محتاج نہیں | ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اسلام کو کسی کی پروا نہیں اگر دنیا کے تمام بادشاہوں کا بادشاہ بھی اسلام کو چھوڑ دے تو اسلام کا کیا حرج، اسلام تو سب سے خطاب کرکے یہ کہتا ہے ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو — دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

احادیث کی عظمت | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ حضورؐ کی تعلیمات میں جو خوبی ہے سبحان اللہ اسکا کیا کہنا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر نماز فجر پڑھ کر ضحیٰ یعنی اشراق کی نماز تک اسی جگہ بیٹھا رہے پھر اشراق پڑھے تو پورے ایک حج اور عمرہ کا ثواب ملیگا (جمع الفوائد) سو مشاہدہ ہے کہ جو نور اور بشاشت و انبساط جگہ نہ بدلنے پر ہوتا ہے وہ جگہ بدلنے پر نہیں ہوتا۔ صوفیہ نے اسی مشاہدہ سے کہا ہے کہ جس قدر ذکر ایک نشست میں ہو سکے زیادہ بہتر ہے۔ اس میں خاص برکت ہوتی ہے۔ ایک دوسری تعلیم یہ بھی تاخیر سحر اور تعجیل افطار کہ اسی واسطے مشروع کیا ہے کہ روزہ کی ابتدا اور انتہا معلوم ہو جائے صوم و غیر صوم میں خلط نہ ہو اسی لئے صوم وصال کی ممانعت آئی ہے افطار میں چاہیے ایک ہی کھجور کھا لے اسی سے فرق تو معلوم ہو جائیگا۔ سو حضورؐ نے حدود کی رعایت فرمائی ہے ورنہ کبھی ضرور ایسا ہو جاتا اور یہ کچھ بعید نہ تھا کہ سحر و افطار نہ ہونے سے لوگ سمجھتے کہ عشاء کے وقت سے روزہ شروع ہو جاتا ہے اور عشاء کے وقت ختم ہوتا ہے۔

عقل کی محدودیت | ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آجکل اس نیچریت نے لوگوں کو زیادہ بد اعتقاد بنا دیا۔ ہر بات کو عقل پر جانچتے ہیں، بیچاری عقل بھی تو مخلوق ہی ہے یہ کہاں تک تیر لگا سکے گی اور کیا خالق کے احکام کا احاطہ کر سکتی ہے اسکا مبلغ پرواز ایک حد تک ہے اس سے آگے وہ معطل ہے۔ احکام کے راز و اسرار کو عقل سے کوئی کیا سمجھ سکتا ہے، مثلاً جبر و قدر ہی کے مسئلہ کو دیکھ لیجئے کہ وہاں تک کسی کی عقل کی رسائی نہیں ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں خوض و بحث سے روک دیا ہے کسی ایسے ہی مسئلہ کے متعلق کسی نے ایک بزرگ سے دریافت کیا تھا کیا خوب فرمایا کہ ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں — بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

بس اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ وہ حاکم ہونے کیساتھ حکیم بھی ہیں جو کچھ کرتے ہیں اسی میں بندہ کیلئے مصلحت ہوتی ہے۔

مولانا محمد اشرف ایم۔اے۔ پشاور

اقبالؒ کا شعر ہے ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

انسان اس عالم میں اللہ تعالیٰ کا نائب بن کر آیا ہے، اور اسے باذنی مناسبت صفات الٰہی کا مظہر بنایا گیا ہے، انسان جس قدر سفلی تقاضوں سے پاک ہوگا اور اپنے جوہر باطنی کو تزکیہ اور احکام الٰہی کی پابندی سے روشن کرتا جائے گا۔ اس میں صفات حق کا انعکاس ہوگا۔ اور وہ خدا کی صفات، جمال و جلال، کمال و تنزیہہ کا آئینہ بن جائے گا۔ انسان کی تکمیل صفات حق کی تجلیات سے ہوتی ہے۔ انسان کا وجود و ظہور اور بقا و ترقی تمام اللہ تعالیٰ کی صفات کے مختلف مظاہر ہیں۔ بندہ جب خدا سے تعلق پیدا کرتا ہے اور ما سوا کے تعلقات سے فارغ ہو کر ذات حق میں ہر آن مشاغل و مشغول ہو جاتا ہے۔ تو صفات رب کا پرتو اس کے ظاہر و باطن کا نور بن جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے گم ہو کر خدا کی ذات سے قائم ہو جاتا ہے، اسی کی ذات سے اسکی ہر ادا، اور اسی جمیل مطلق کے اشاروں سے اسکی ہر حرکت و سکون ہونے لگتی ہے، صوفیہ کی اصطلاح میں اسے فنا و بقا کا مقام کہتے ہیں۔ یعنی اپنی ذاتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے، اور وہ آلہ رب بن کر اس عالم میں زندگی گذارتا ہے، اور یہ کمال اسے صبغۃ اللہ میں رنگ جانے اور عبدیت میں کامل ہو جانے سے نصیب ہو جاتا ہے۔ قرآن اسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ——— اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔

یہ اللہ کا رنگ صفات الٰہیہ کے رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے اقبالؒ کہتا ہے ؎

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ
عشق را ناموس و نام و ننگ دہ

اقبال کے مرشدِ معنوی مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

آنکہ او بے نقش و سادہ سینہ شد
نقشہائے غیب را آئینہ شد
آدم اصطرلاب اوصاف علو است
وصف آدم مظہر آیات اوست
ہرچہ در وے مے نماید عکس اوست
ہمچو عکس ماہ اندر آب جو است
خلق را چوں آب داں صاف و زلال
اندرو تابان صفات ذوالجلال
علم شان و عدل شان و لطف شان
چوں ستارہ چرخ در آب رواں

اقبالؒ کا قول ہے ؎

آنکہ در سینہ بپیچد یک نفس
سرے از اسرار توحید است و بس
رنگ او برکن مثال او شوی
در جہاں عکس جمال او شوی

بندہ مومن کا انتہائے کمال اللہ تبارک و تعالیٰ کا قرب خاص اس کے احکام کی پابندی اور اس کا نائب بن کر نقشِ حق کو عالم پر مرتسم کرنا ہے۔ قربِ الٰہی، احکامِ الٰہیہ کی پابندی اور نائبِ حق کی حیثیت سے جس قدر اللہ تبارک و تعالیٰ کے صفاتِ جلال و جمال، کمال و تنزیہہ کا پرتو اسکی ذات سے ظاہر ہو گا۔ اسی قدر انسان اپنے فرائض مظہرِ حق اور خلیفۂ ربانی بن کر ادا کر سکے گا۔ خداوند قدوس کی جلالی و جمالی اور کمالی صفات ہی مومن کے ایمان کے عناصر ہیں۔ ذاتِ حق کی کنہ تک پہنچنا ممکن نہیں۔ معرفتِ الٰہی کا زینہ صفاتِ حق

کی ہی پہچان و یافت ہے۔ بندۂ مومن چونکہ خلیفۂ الٰہی ہے۔ اس لئے اس کا باطن خدا کی ہر قسم کی صفات کا تجلی گاہ ہے، اور مومن انہیں صفات کے مجموعہ سے اپنے اخلاق و کردار کو وجود بخشتا ہے۔ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

خدا کی صفات جمال و کمال و جلال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر ایک صفت کا غلبہ ہو تو اعتدال جو خلافت کیلئے ضروری ہے، باقی نہیں رہ سکتا۔ اس بنا پر مومن سے ہر موقع و محل کے مطابق مناسب صفات کا ظہور ہوتا ہے۔ "ضرب کلیم" میں مومن کے عنوان پر اقبالؒ نے جو کہا ہے وہ ہمارے اس قول کی تصدیق کرتا ہے۔ کہتا ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اسکی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اسکی نظر میں
جبرائیل و اسرافیل کا صیاد ہے مومن
کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

جب اس سے صفات جمال کا اظہار ہوتا ہے۔ تو وہ ہے جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم۔ اور جب وہ جلال کا مظہر بنتا ہے تو۔ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان۔ ؎

اگر ہو جنگ تو شیران غاب سے بڑھکر
اگر ہو صلح تو رعنا غزال تاتاری

بندۂ مومن کی انہیں متضاد و مختلف صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

قلندران کہ براہ تو سخت می کوشند
زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند
بخلوت اند و زمان و مکان در آغوشند

درین جہاں کہ جمالِ تو جادہ ہا دارد
ز فرق تا بقدم دیدہ و دل دگر گشتند
بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر
بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند

مومن کی یہ جامعیت صفاتی اسی ذاتِ جمیل و جلیل کا فیض کامل تھی ۔ جو اس عالم میں صفاتِ الٰہی کا مظہرِ اتم بن کر آیا تھا ۔ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

مومن کی جلالی و جمالی صفات کے متعلق قرآن کہتا ہے : اشداء علی الکفار رحماء بینہم ۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی (صحابہؓ) کفار پر جابری و غالب ہیں ، اور آپس میں رحم کرنے والے ہیں ۔

غرض مومن خدا کا بندہ بن کر اسکی صفات میں رنگین ہو کر کبھی جلالِ الٰہی کا مظہر بنتا ہے ، کہیں جمالِ ربانی کا منظر پیش کرتا ہے ۔ اور کبھی کمالِ خداوندی کا پرتو اسکی ذات سے ظاہر ہوتا ہے ۔

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

یہی بندہ مومن ہے جو اللہ کا ہاتھ بن کر عالم میں خدا کی حدود کا اجرا ، اس کے احکام کا نفاذ کرتا ہے ، اور خدائی صفات کی مختلف شئون و تجلیات اسکی ذات سے ظہور پاتی ہیں ۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اسکی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اسکی ادا دلفریب اسکی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو !
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

مومن کی صفات چہار گانہ — قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — حقیقت میں ان صفات الٰہیہ کا امتزاج ہے، جن کی تشکیل سے مومن کا اخلاق بنتا ہے، قہاری خدا کی صفات جلال کا عکس ہے۔ غفاری جمالی صفات کا پرتو ہے۔ قدوسی صفات تنزیہہ کا ظل ہے۔ اور جبروت کمالی صفات کا سایہ ہے، پہلی صفت کا حاصل حق کے لئے غلبہ و سطوت، دوسری صفت کا مدعا قوت پاکر مظلوموں زیر دستوں یہاں تک کہ قاہروں اور جابروں کو بخش دینا ہے۔ تیسری صفت قدوسی کا منشا عفت و پاکیزگی، تزکیہ باطن و تطہیر نفس وقلب ہے۔ چوتھی صفت کا خاصہ ان صفات سہ گانہ کو اپنا کر خلافت الٰہیہ کے مقام پر اس طرح فائز ہونا ہے کہ اس کے ہیبت و جلال کی بنا پر کوئی شخص احکام الٰہی سے سرتابی نہ کر سکے۔

صفات کے متعلق اس اجمال بیان کے بعد ہم صرف غفاری کی کچھ مختصر تشریح پر اکتفا کرتے ہیں — اسلام کا خدا غفور ہے بقول سید سلیمان ندویؒ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو جگہ غافر (بخشنے والا) کہا ہے، پانچ دفعہ غفار (بڑی بخشائش کرنے والا) اور اتنی ہی دفعہ عفو اور ستر سے زیادہ آیتوں میں غفور کہا ہے۔ خدا نے اپنی اس صفت کی تجلی کا پرتو پیدا کرنے کے لئے مومنین کو کھلی دعوت دی ہے:

قل للذین آمنوا یغفروا للذین لا یرجون ایام اللہ — ایمان والوں سے کہہ دے کہ جو اللہ کے جزا و سزا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے انہیں معاف کر دیا کریں۔

مومنین کی صفت بتائی:

وَاِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ — جب غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔

مسلمانوں کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سراپا بخشش و رحمت ہے، اور اس کا پرتو تمام مومنین کی ذات سے ہویدا، یہی مغفرت و بخشش، عفو و درگذر کا جذبہ ہے جو عملاً اس امت کا خاصہ ہے، اور جو لوگوں پر شفقت کی ایمانی صفت سے وجود میں آیا ہے — اقبالؒ کہتا ہے ؎

فطرت مسلم سراپا شفقت است
در جہاں دست و زبانش رحمت است
آنکہ مہتاب از سر انگشتش دو نیم
رحمت او عام و اخلاقش عظیم

یہی غفاری کا بے پایاں جذبہ تھا جس کی وجہ سے نبی پاک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خون کے پیاسوں، وطن سے بے وطن کرنے والوں اور طرح طرح کی اذیت دینے والوں کو فتح مکہ کے دن یہ کہہ کر بخش دیا : لاتثریب علیکم الیوم انتم الطلقاء (آج کے دن تم پر کوئی تنگی و پکڑ نہیں۔ تم سب کے سب آزاد ہو) زہر کھلانے والی یہودیہ سے باز پرس نہیں کی۔ پیارے چچا کے قاتل وحشی پر دار و گیر نہیں فرمائی۔ دانت شہید کرنے والوں، پتھر برسانے والوں، خون میں نہلانے والوں کو ہمیشہ بخشتے، نوازتے اور دعائیں دیتے رہے۔ اور یہی نمونہ و اسوہ صحابہ کرامؓ نے پیش کیا، اور یہی دستور ہر زمانہ میں خاصانِ خدا اور مومنینِ کاملین کا رہا۔ کاش! آج پھر مسلمان ان صفات الٰہیہ کا مظہر بن کر عالم میں جلوہ گر ہو تو اسلام کی رحمت اور برکت سے پوری دنیا بھر سے امن و سکون چین و راحت کا گہوارہ بن جائے کہ :

قاہری با دلبری پیغمبری است

اور پیغمبرانہ کردار ہی عالم کی نجات کا ذریعہ ہے ——————

تردید فتنۂ انکار حدیث

مولانا عبد الغفور سہروردی متخصص مدرسہ نیو ٹاؤن کراچی

تصحیح احادیث کا معیار

قسط ۲

● ۔ یہ ممکن ہی کیسے ہو سکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو سوال "هل یکذب المؤمن (کیا مومن جھوٹ بولتا ہے) کے جواب میں "المؤمن لا یکذب" (کہ مومن جھوٹ نہیں بولتا یعنی بڑے سے بڑا گناہ ۔ زنا چوری وغیرہ ۔۔۔ تو کر سکتا ہے پر جھوٹ کبھی نہیں بولتا) فرمارہے ہوں اور صحابہ کرامؓ جیسے مومنین حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولتے ہوں۔ العیاذ باللہ۔

● ۔ ان حضرات کے تو کذب بیانی کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے چہ جائیکہ وہ عملاً اس کا ثبوت بھی دیتے ۔ ع ۔ ایں خیال ست و محال ست و جنوں ۔

● ۔ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال و افعال کی اشاعت کی تاکید فرمائی وہاں یہ سخت ترین تہدید اور وعید بھی فرمائی کہ :

اتقوا الحدیث عنی الا ما علمتم	ہر رطب و یابس کو میری طرف منسوب کرکے بیان
فمن کذب علی متعمداً فلیتبوأ	کرنے سے بچو بس وہی بات میری طرف منسوب
مقعدہ من النار (مشکوٰۃ ص ۳۵)	کیا کرو جسکو تم جان لو کہ واقعی میری بات ہے۔ اس

لئے کہ جس نے مجھ پر عمداً جھوٹ بولا (جو میری حدیث نہ تھی اسکو میری طرف منسوب کر دیا) تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے ۔

اس تہدید اور وعید کے بعد یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت پر جان

تک پہنچا دینے والے شمع نبوت کے پروانے حدیث میں کذب بیانی پر سخت ترین وعید کے سنتے ہوئے قصداً آپ کی طرف نسبت کرکے کذب بیانی کرتے۔ — اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں حدیث میں عمداً جھوٹ کا نام و نشان احتمال کے درجہ میں بھی نہ تھا ان راوی کی قوت و ضبط اور فہم کے اعتبار سے فرق ضرور ہوتا تھا۔ اسی فرق اور خطاء و نسیان کے احتمال کی بنا پر (اگرچہ یہ خطاء و نسیان ایسا نہ تھا جو کہ قابل اعتراض یا حدیث میں کسی جرح و قدح کا سبب ہوتا۔ اس لئے کہ صحابہ کرام خدا اور رسول کی شہادت کے بموجب عادل ہیں) خود صحابہ کرام بھی ہر حدیث کو بے دھڑک قبول نہیں کیا کرتے تھے بلکہ یا تو صرف متواتر و مشہور روایات کو قبول کرتے یا ان اخبار آحاد کو کہ جن کے رواۃ میں ایسے لوگ نہ ہوتے جو مشکوک فی ضبط و الحفظ ہوں۔ اس وقت صحابہؓ کے دل مطمئن ہو جاتے اور وہ اخبار احاد کو قبول کر لیتے۔ اور اگر کسی حدیث کو بظاہر قرآن کی نص صریح یا معروف احادیث کے مخالف یا منافی پاتے یا کسی روایت میں مزید اطمینان کی ضرورت ہوتی تو اسکو اس وقت تک قبول نہ کرتے جب تک اس پر شہادت قبول نہ کر لیتے۔ اور یہ طلب شہادت اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ صحابہ کرامؓ قابل اعتماد نہ تھے۔ (نعوذ باللہ) بلکہ صرف دل کے اطمینان اور تثبت کیلئے اور آئندہ آنے والی نسل کی رہنمائی کے لئے یہ کرتے تھے۔

بعض صحابہؓ کا حدیث پر شہادت طلب کرنے کی وجہ | صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ انہوں نے محض تثبت کیلئے راوی حدیث سے گواہ طلب کئے۔ پھر حدیث قبول کی ہم صرف دو واقعے ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ ان کے پاس ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تشریف لائے انہوں نے آکر اسلامی دستور کے مطابق سلام کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ کسی کام میں مشغول تھے اس لئے جواب نہ دے سکے۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے حسب ارشاد نبوی دوسرا اور پھر تیسرا سلام کیا۔ جب کوئی جواب نہ ملا اور اندر داخلے کی اجازت نہ ملی تو شریعت کے قاعدے کے مطابق واپس چلے۔ وہ لوٹے ہی تھے کہ ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلوایا۔ اور فرمایا کہ تم اندر کیوں نہیں آگئے۔؟ واپس کیوں چل دئے؟ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے فرمایا:

استأذنت ثلاثا فلم یؤذن لی : میں نے تین مرتبہ (اندر آنے کی) اجازت چاہی
فرجعت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : مجھے اجازت نہ دی گئی تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اذا استاذن احدکم ثلاثا	کے ارشاد کر: اگر تم میں سے کوئی (کسی سے
فلم یوذن لہ فلیرجع۔	اس کے گھر میں داخلے کیلئے) تین دفعہ اجازت
بخاری ص ۹۲۳ ج ۲	طلب کرے اور اسکو اجازت نہ دی جائے

تو وہ واپس لوٹ جائے" کے بموجب واپس لوٹ گیا

اس پر حضرت عمر فاروق نے فرمایا کہ

واللہ لتأتین علی ھذا ببرھان و	خدا کی قسم یا تو اس پر گواہ لاؤ (کہ واقعی تم نے
بینۃ اولافعلن بک۔	یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
مسلم و بخاری ص ۹۲۳ ج ۲، باب الاستئذان جامع ترمذی ص ۱۱۰	سنی ہے) یا پھر (آج) میں تمہارے

ساتھ کچھ کر گزروں گا۔

چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ گئے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کو بطور گواہ لاکر پیش کیا تب جان چھوٹی۔

یہ طلب شہادت اس وجہ سے نہ ہوئی تھی کہ حضرت عمرؓ کو حضرت ابوموسیٰؓ کے بارے میں غلط بیانی کا خیال تھا بلکہ صرف تثبت کے طور پر ہوئی تھی۔ چنانچہ مؤطا مالکؒ، باب فی الاستئذان میں حضرت عمرؓ کی تصریح موجود ہے کہ:

فقال عمر لابی موسیٰ اما انی لم	حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰؓ سے فرمایا
اتہمک ولکن خشیت ان یتقول	کہ یہ بات (ہرگز) نہیں ہے کہ میں تم کو متہم
الناس علی رسول اللہ صلی اللہ	(بالکذب) سمجھتا تھا (اس سے شہادت
علیہ وسلم۔ مؤطا مالک ص ۳۵۶	طلب کی) لیکن مجھے یہ ڈر ہوا کہ کہیں لوگ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ گھڑنے لگ جائیں۔ (اس لئے بطور حفظ ماتقدم میں نے یہ اقدام کیا۔ لوگوں کو جب ثبوت پیش کرنے کا ڈر ہوگا تو جھوٹی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف منسوب نہیں کریں گے)

اس کے علاوہ اسی حدیث کے الفاظ میں، ایک طریق میں ہے کہ اما انی لم اتہمک ولکن اردت ان لایتجرء الناس علی الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ فتح الباری ص ۲۵ ج ۱۱۔

حاصل یہ ہے کہ صحابہ کرام میں کذب کا نام و نشان تک نہ تھا ہم کو جو کچھ تحقیق اور تلاش و جستجو صحابہؓ کے زمانہ میں ملتی ہے، وہ سب احتیاط، تلبیب اور تثبت پر مبنی ہے۔

۲۔ اسی طرح کا واقعہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا بھی ہے، کہ انہوں نے میراث جدہ میں حضرت مغیرہؓ کی بات اس وقت تک نہیں مانی جب تک کسی شاہد نے گواہی نہ دیدی۔

عن قبیصۃ بن ذؤیب قال جاءت الجدۃ ام الام او ام الاب الی ابی بکر فقالت ان ابن ابنی او ان ابن ابنتی مات وقد اخبرت ان لی فی الکتاب حقا۔ فقال ابوبکر ما اجد لک فی الکتاب من حق۔ وما سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضی لک بشیٔ وسأسأل الناس۔ قال فسأل الناس فشہد المغیرۃ ابن شعبۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعطاھا السدس قال ومن سمع ذالک معک؟ قال محمد بن مسلمۃ قال فاعطاھا السدس۔ ترمذی ۲۵ باب فی میراث الجدۃ۔

قبیصۃ بن ذؤیب سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک جدہ۔ دادی یا نانی۔ آئی اور کہا کہ میرا پوتا۔ یا یہ کہا کہ میرا نواسا فوت ہو گیا ہے اور مجھ کو یہ پتہ چلا ہے کہ از روئے کتاب اللہ اس کے مال میں میرا حق ہے (وہ مجھے دیدیجئے) حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں تو کتاب اللہ میں (پوتے یا نواسے کے مال میں دادی کا) کوئی حق نہیں پاتا۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا کہ آپؐ نے تیرے لئے کوئی فیصلہ فرمایا ہو۔ (ہاں) میں لوگوں سے پوچھتا ہوں (چنانچہ) لوگوں (صحابہ کرام) سے اسکی بابت پوچھا تو مغیرۃ بن شعبہؓ نے فرمایا کہ ہاں (پوتے یا نواسے کے مال میں دادی کا حصہ ہے۔ چنانچہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دیا تھا۔ اس پر حضرت صدیق اکبرؓ نے (تثبت کیلئے) فرمایا کہ کیا کسی اور نے بھی تمہارے ساتھ اس بات کو سنا ہے۔ تو مغیرۃ بن شعبہؓ نے فرمایا کہ ہاں محمد بن مسلمۃؓ ہیں، تب جا کر صدیق اکبرؓ نے جدۃ کو سدس (چھٹا حصہ) دیا۔

اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضرت مغیرۃ بن شعبہؓ کی حدیث پر اعتماد نہیں تھا۔ اس لئے گواہ طلب کیا۔ بلکہ یہ جو کچھ کیا تثبت کیلئے کیا چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مقدمہ فتح الملہم میں ذہبیؒ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ:

فمراد الصدیقؓ التثبت فی الاخبار والتحری لاسد باب الروایۃ۔" مقدمہ فتح الملہم صـ۹

حضرت صدیق اکبرؓ کی گواہ طلب کرنے سے مراد احادیث میں تثبت اور تحری تھی نہ کہ روایۃ کا دروازہ بند کرنا۔

الغرض صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں عمداً جھوٹ کا نام ونشان تک بھی نہ تھا۔ ہاں سہو ونسیان کا احتمال اور قوت وضبط میں فرق ضرور تھا، اسی احتمال اور فرق کا نتیجہ تھا کہ صحابہؓ نے تثبت کے طور پر گواہیاں طلب کیں۔ یہ تو خیر صحابہ کرامؓ کا زمانہ تھا۔ کبار تابعین کے دور میں بھی یہی صورت حال قائم رہی۔ مگر اس دور فرق ضالہ۔ خوارج، شیعہ، مرجیہ، اور معتزلہ وغیرہ کے زور پکڑ جانے اور اپنے اپنے مسلک کی تائید کی غرض سے نو بنو حدیثیں گھڑنے کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا تھا۔ اس لئے محدثین کرام نے فرمان نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)

کفیٰ بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع "	کسی انسان کے جھوٹا ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ سنے (بلاتحقیق) اسکو آگے چلا دے۔

کے بمصداق خود کو ارتکاب کذب سے بچانے کیلئے ہر حدیث کے ایک ایک راوی کی جانچ پڑتال شروع کی۔ چنانچہ امام محمد بن سیرین المتوفی ۱۱۰ھ فرماتے ہیں کہ:

لم یکونوا یسئلون عن الاسناد فلما وقعت الفتنۃ قالوا سموا لنا رجالکم۔ فینظر الی اھل السنۃ فیوخذ حدیثھم وینظر الی اھل البدع فلا یوخذ حدیثھم۔ مقدمہ مسلم ص۱۱	(جب خیر کا زمانہ تھا تو) محدثین اسناد کے بارے میں نہیں پوچھا کرتے تھے جب فتنہ کا دور آیا تو (پھر وہ ہر اسناد کو قبول نہ کرتے تھے بلکہ) کہتے تھے کہ رجال سند کے نام بتلاؤ ـــ تاکہ (رواۃ کی پہچان بین کی جائے) دیکھا جائے

کون اہل السنۃ ہیں کہ ان سے حدیث لی جائے اور کون اہل بدعت ہیں کہ ان کی روایت سے اجتناب کیا جائے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ متوفی ۶۸ھ سے بھی اسی قسم کی بات مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"عن مجاھد قال جاء بشیر بن کعب العدوی الی ابن عباس فجعل یحدث ویقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجعل ابن عباس لایاذن لحدیثہ ولا ینظر الیہ۔ فقال یا ابن عباس	مجاہد سے روایت ہے کہ (ایک دفعہ) بشیر بن کعب العدوی ابن عباسؓ کے پاس آئے اور لگے حدیثیں بیان کرنے اور کہتے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابن عباسؓ تھے کہ اسکی حدیث سنتے ہی نہ تھے اور نہ ہی اسکی طرف دیکھتے تھے۔

مالي لا أراك تسمع لحديثي أحدثك عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا تسمع۔ فقال ابن عباس إنا كنا مرة إذا سمعنا رجلا يقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ابتدرته أبصارنا وأصغينا إليه بآذاننا۔ وفي رواية إنا كنا نحدث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم إذ لم يكن يكذب عليه فلما ركب الناس الصعب والذلول لم نأخذ من الناس إلا ما نعرف۔

مقدمہ مسلم صنا

(اس پر) بشیر بن کعب نے کہا کہ اے ابن عباس کیا بات ہے کہ آپ میری حدیثیں نہیں سنتے۔ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں بیان کرتا ہوں اور آپ ہیں کہ اس طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ ابن عباسؓ نے (اپنی حالت بتلاتے ہوئے) کہا کہ ایک زمانہ ہم پر یہ گذرا ہے کہ کوئی آدمی جب یہ کہتا تھا کہ "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" تو ہماری نگاہیں فوراً اس طرف بے ساختہ اٹھ جاتی تھیں اور ہم اپنے کانوں کو اس طرف جھکا دیتے تھے (پھر عدم التفات کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ) ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے حدیثیں اس زمانہ میں بیان کیا کرتے تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط سلط حدیثوں کو منسوب کرکے بیان کرنے کا رواج نہیں پڑا تھا، مگر جب لوگ ہر سرکش و غیر سرکش اونٹوں پر سوار ہونے لگے۔ (سچ جھوٹ کی تمیز جاتی رہی) تو ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے حدیثوں کو بیان کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اب ہم اسی حدیث کو لیتے ہیں جسکو ہم پہچانتے ہیں۔

الغرض جب فتنے کا دور آیا اور فرقِ ضالہ نمودار ہو گئے تو محدثین کرام نے رواۃِ حدیث کی جانچ پڑتال شروع کردی۔ اس کے نتیجہ میں علماء اصولِ حدیث کو صحیح، ضعیف، مقبول اور متروک وغیرہ قسمیں بیان کرنا پڑیں۔ پھر صحیح حدیث کے بھی راویوں کے حافظہ اور یادداشت کے تفاوت کی وجہ سے بہت سے مراتب تھے اس لئے بعد کے علماء اصول نے ان مراتبؒ مدارج کی وضاحت کیلئے ایک تیسری قسم حسن کا بھی اضافہ کیا اور راویوں کے مختلف طبقات قائم ہو گئے۔ آگے چل کر محدثینِ عظام نے مزید وضاحت کیلئے اقسام میں اور اضافہ کیا، اور صحیح لذاتہ، صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ، حسن لغیرہ اور ضعیف وغیرہ اقسام وجود میں آگئیں۔

مسلمانوں میں اگرچہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ دوسری صدی میں شروع ہو گیا تھا، مگر علوم و فنون کی باقاعدہ تدوین کا سلسلہ تیسری صدی سے شروع ہو کر چوتھی صدی میں شباب پر پہنچا۔

اور علم اصول حدیث کی باقاعدہ تدوین ہوئی۔ اس وقت علماء اصول حدیث نے علم اصول حدیث کو باضابطہ طور پر مدون کیا۔ اور حدیث کے مذکورہ بالا فرق مراتب کو جو صحابہ کرامؓ اور کبار تابعین کے دور سے ہی چلا آرہا تھا پیش نظر رکھ کر حدیث کی یہ تقسیم کی۔

اب مصنفین حضرات کی تصنیف میں طریق کار مختلف تھے۔ کسی نے اپنی کتاب کو ایک ہی قسم کے ساتھ مختص کر لیا۔ جیسے کہ بخاری و مسلم کہ انہوں نے فقط صحاح احادیث کو اپنی کتابوں میں درج کیا، اور بعض حضرات نے صحیح کے ساتھ حسن احادیث کو بھی لیا۔ اور بعض نے ضعیف احادیث کو بھی اپنی کتابوں میں جگہ دی، مگر ان کے ضعف اور وجہ ضعف پر متنبہ بھی کر دیا جیسے کہ سنن اربعہ، ان کے مصنفین نے تمام اقسام کو لیا[1]۔

اس مختصر تمہید اور سوال کے جواب کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کہ "معیار تصحیح حدیث" کیا ہے۔؟ آیا کتب صحاح کے اندر کسی حدیث کا موجود ہونا یا راوی (مروی حدیث) میں شرائط صحت کا پایا جانا۔ لیکن اس پر بحث کرنے سے پہلے حدیث صحیح کی تعریف کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

حدیث صحیح کی تعریف حافظ ابو عمرو ابن صلاح متوفی ۶۴۳ھ حدیث صحیح کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ:

اما الحدیث الصحیح فهو الحدیث المسند الذی یتصل اسناده بنقل العدل الضابط عن العدل الضابط الی منتهاه، ولا یکون شاذا ولا معللا۔	(یعنی صحیح حدیث وہ ہے جسکو عادل (ثقہ) وضابط راوی اپنے جیسے سے آخر تک باتصال سند اور بغیر تعلیل وشذوذ کے روایت کرے۔

مقدمہ ابن صلاح ص۸ مطبوعہ مدینہ منورہ

---

[1] یہ بھی واضح رہے کہ سنن اربعہ کا وجود اس پر بین ثبوت ہے کہ حدیث صحیح کی طرح حسن وضعیف بھی حدیثیں ہی ہیں، ورنہ انکی تخریج کا کیا مطلب۔؟ جن حضرات نے حسن وضعیف حدیث کے حدیث ہونے کا انکار کیا ہے وہ انکا خواہشات نفسانی کی پیروی میں ان کی ذہنیت فاسدہ کا اختراع ہے جس کیلئے شرع میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ ۱۲

گویا حدیث صحیح کی پانچ شرطیں ہیں۔ ۱۔ اتصال سند۔ ۲۔ عدالت (ثقاہت)۔ ۳۔ ضبط راوی۔ ۴۔ عدم شذوذ (غیر معروف نہ ہونا) ۵۔ عدم علۃ قادحہ (کسی مانع صحت عیب کا نہ ہونا۔)

کسی حدیث کے صحیح ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس میں یہ شرطیں پائی جائیں۔ پھر ایسی حدیث صحیح کے دو مصداق ہیں۔ اول، مصداق تو یہ ہے کہ وہ حدیث یا تو کتب خمسہ (بخاری، مسلم ابوداؤد، ترمذی، نسائی) میں سے کسی کتاب میں ہو یا اسکی صحت پر متقدمین میں سے کسی کی تصریح موجود ہو۔ ایسی حدیث بالاتفاق صحیح ہے، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں، یہ اختلاف تو ہو سکتا ہے کہ یہ شرطیں فلاں حدیث میں پائی جاتی ہیں یا نہیں، لیکن جس حدیث میں یہ شرطیں پائی جائیں اور اس کے ساتھ وہ حدیث کتب صحاح میں سے کسی کتاب میں موجود بھی ہو یا اسکی صحت پر متقدمین میں سے کسی نے تصریح کی ہو اسکی صحت میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔
ثانی، مصداق وہ حدیث ہے کہ نہ تو وہ کتب خمسہ میں سے کسی کتاب میں مذکور ہو اور نہ ہی متقدمین میں سے کسی نے اس کے صحیح ہونے کی تصریح کی ہو، لیکن اس میں صحیح ہونے کی وہ تمام شروط پائی جاتی ہوں جو ائمہ جرح و تعدیل نے تجویز کی ہیں۔ اس کے تمام راوی معیار صحت پر پورے اترتے ہوں۔ حدیث صحیح کے اس مصداق میں اختلاف ہے۔ کہ ایسی حدیث پر متاخرین علماء حدیث کو صحت کا حکم لگانیکا حق ہے یا نہیں۔؟ اور اس کے مجاز ہیں یا نہیں۔؟

بیان مذاہب | تو اس بارے میں متقدمین میں سے شیخ ابن صلاح المتوفی سنہ ۶۴۳ھ اور متاخرین میں سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی رائے یہ ہے کہ متاخرین کو ایسی حدیث کی تصحیح و تضعیف کے مجاز نہیں ہیں کہ جو نہ تو کتب خمسہ میں سے کسی کتاب میں ہو اور نہ ہی متقدمین میں سے کسی کی تصریح اسکی صحت کے بارے میں موجود ہو، اگرچہ اس میں صحت کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں۔

چنانچہ شیخ ابن الصلاحؒ فرماتے ہیں:

اذا وجدنا فیما نروی من کتب الحدیث وغیرها حدیثا صحیح الاسناد ولم نجده فی احد الصحیحین ولا منصوصاً علی صحته فی شیئ من مصنفات

جب ہم (متاخرین سے) کتب حدیث وغیرہا (تالیفات) میں کوئی صحیح الاسناد حدیث پائیں لیکن نہ تو وہ حدیث صحیحین میں سے کسی کتاب میں ہو اور نہ ہی ائمہ حدیث کی

ائمۃ الحدیث المعتمدۃ المشھورۃ فاٰلا نتجاسر علیٰ جزم الحکم بصحتہ فقد تعذر فی ھذہ الاعصار الاستقلال بادراک الصحیح بمجرد اعتبار الاسانید لانہ مامن اسناد من ذالک الا ونجد فی رجالہ من یعتمد فی روایتہ علیٰ مافی کتابہ عریا عما یشترط فی الصحیح من الحفظ والضبط والاتقان. فآل الامراذًا فی معرفۃ الصحیح الی الاعتماد علیٰ مانص علیہ ائمۃ الحدیث فی تصانیفہم المعتمدۃ ۔

مقدمہ ابن الصلاح صہ۱۲ و ۱۳

مشہور و معتمد کتب میں سے کسی کتاب میں اسکی صحت پر تصریح موجود ہو تو ہم (باوجود اس حدیث کے صحیح الاسناد ہونے کے) اس پر حتمی طور پر صحت کا حکم لگانے کی جرأت نہیں کریں گے ۔ (اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ) اس زمانہ میں محض اسانید کی وجہ سے صحیح کا ادراک مشکل ہوگیا ہے ۔ اس لئے کہ اس قسم کی جس سند کو بھی ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سند کے رجال نے روایت بیان کرتے وقت اسی روایت پر اعتماد کیا ہے جو اسکی کتاب میں موجود تھی ۔ (اس نے اپنے حافظہ سے روایت نہیں کی) اور جو حفظ و ضبط اور اتقان صحیح میں تھا راوی میں وہ موجود نہیں لہذا اب (جبکہ اس میں صحیح کے شرط نہیں پائے گئے اور اسکی صحیح الاسناد حدیث صحت کا حکم لگانا دشوار ہے) تو لامحالہ تصحیح حدیث کے بارے میں ائمہ مجتہدین کی تصریحات پر ہی اعتماد کیا جائے گا۔

شیخ ابن صلاح ؒ کی اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ :

۱۔ چونکہ اسانید متاخرہ میں خلل واقع ہوگیا ہے ۔
۲۔ کیونکہ آج کے زمانہ میں جو بھی کوئی حدیث بیان کرتا ہے ، وہ اپنی کتاب پر اعتماد کرتے ہوئے کتاب سے ہی بیان کرتا ہے ۔
۳۔ اور کتاب سے بیان کرنا دلیل ہے اس بات کی کہ صحیح حدیث میں جو حفظ شرط تھا وہ اس میں موجود نہیں۔

ؑ حافظ ابن الصلاح صحیح کی شروط میں حفظ کی شرط کو بھی شمار کیا ہے ۔ یہ جمہور کی تعریف کے خلاف ہے ، کما سیجیئ انشاء اللہ تعالیٰ ۔ ۱۲

۴۔ اس لئے محض اسانید کی وجہ سے صحیح کا ادراک اس زمانہ میں مشکل ہو گیا ہے۔
۵۔ لامحالہ تصحیح حدیث میں متقدمین کی تصریحات پر ہی اعتماد کرنا پڑے گا۔

حاصل یہ کہ شیخ ابن صلاح کے نزدیک صحت حدیث کا معیار یا تو کتب ہیں یا متقدمین میں سے کسی کی تصریح، محض شروط صحت کا کسی حدیث کے رواۃ میں پایا جانا ان کے نزدیک معیار صحت نہیں ہے۔

لیکن شیخ ابن صلاح اور شاہ ولی اللہ کے نظریئے کے برعکس متقدمین میں سے امام نووی المتوفی ۶۷۶ھ اور متاخرین میں سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی رائے یہ ہے کہ متاخرین بھی اس کے مجاز ہیں کہ وہ کسی ایسی حدیث پر صحت کا حکم لگائیں جس میں ائمہ متقدمین کی تجویز کردہ صحیح کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں۔ اگرچہ اسکی تخریج کتب خمسہ میں نہ کی گئی ہو، اور اگرچہ متقدمین میں سے اسکی صحت پر کسی کی تصریح بھی موجود نہ ہو، بشرطیکہ حکم لگانے والے محدث کے اندر قواعد جرح و تعدیل کی معرفت تامہ اور ملکہ قویہ موجود ہو، یہ نہیں کہ ہر کہ ومہ اٹھ کر حدیث نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر نشتر زنی شروع کر دے، اور اپنے مزعومات باطلہ کی تائید میں کسی حدیث پر جرح اور کسی کی تعدیل کرتا پھرے۔

حاصل یہ نکلا کہ امام نووی اور شیخ عبدالحق کے نزدیک صحت کا مدار نہ کتب خمسہ میں اور نہ ہی متقدمین میں سے کسی کی اس بارے میں تصریح بلکہ اصل معیار تصحیح ان کے نزدیک کسی حدیث میں صحیح کی شروط کا پایا جانا ہے، چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں:

"والاظہر عندی جوازہ لمن تمکن وقویت معرفتہ۔ تقریب مع التدریب ص۴۹	میرے نزدیک راجح یہی ہے کہ جس شخص کے اندر (احادیث صحیح کی) معرفت تامہ اور (جرح و تعدیل کی) قدرت کاملہ ہو، اس کیلئے ایسی حدیث پر صحت کا حکم لگانا جائز ہے۔

حافظ زین العراقی المتوفی ۸۰۶ھ اسی کو جمہور اہل حدیث کا مذہب بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

وھو الذی علیہ عمل المحدثین۔ تدریب ص۴۹	یہی ہے وہ (قول محکم) کہ جس پر ائمہ حدیث کا عمل ہے۔

چنانچہ ہم کو حافظ عراقی کے اس قول کے مطابق متاخرین میں سے ایک ایسی جماعت ملتی ہے کہ جس نے قواعد صحیحہ کی روشنی میں ایسی ایسی احادیث کی تصحیح کی کہ جو نہ تو کتب خمسہ میں تھیں

اور نہ ہی ان کی صحت پر متقدمین کی تصریح موجود تھی، ان میں سے بعض تو شیخ ابن صلاح کے ہی معاصر ہیں اور بعض بعد کے طبقہ کے ہیں۔ معاصرین میں سے ایک تو :

۱۔ حافظ ابن قطان المتوفی ۶۲۸ھ ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "الوہم والایہام" میں حدیث ابن عمرؓ۔ انہ کان یتوضأ ونعلاہ فی رجلیہ ویمسح علیہما ویقول کذالک کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یفعل ــــ اخرجہ البزار۔ کی تصحیح کی ہے۔ اسی طرح انہوں نے حدیث انسؓ ــ کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینتظرون الصلوٰۃ فیضعون جنوبہم فمنہم من ینام ثم یقوم الی الصلوٰۃ ــــ اخرجہ ابن اصبغ ۔ کی بھی تصحیح کی۔ شیخ کے دوسرے معاصر :

۲۔ حافظ ضیاء الدین مقدسی المتوفی ۶۴۳ھ ہیں (یہی سن وفات ابن صلاح کا ہے۔) انہوں نے بھی اپنی کتاب "المختارہ" میں ایسی ایسی احادیث کی تصحیح کی ہے۔ کہ جن کی صحت پر متقدمین میں سے کسی کی تصریح نہیں پائی جاتی۔ شیخ کے معاصرین میں سے :

۳۔ حافظ زکی الدین منذری م ۶۵۶ھ بھی ہیں، انہوں نے بھی حدیث : نعیم عن وھب اور حدیث : یونس عن الزھری اور حدیث ابی سلمۃ عن ابی ھریرۃ فی "غفران ما تقدم من ذنبہ وما تاخر" کی تصحیح کی۔

اسی طرح ابن صلاح کے بعد کے طبقے کے محدثین نے بھی ایسی ایسی احادیث کی تصحیح کی کہ جنکی تصحیح کا حق شیخ متاخرین کو دینے کے لئے تیار نہیں۔ چنانچہ :

۱۔ حافظ شرف الدین دمیاطی المتوفی ۷۰۵ھ نے حدیث جابرؓ ــــ ماء زمزم لما شرب لہ ــــ کی تصحیح کی، اسی طرح :

۲۔ حافظ تقی الدین سبکی المتوفی ۷۵۶ھ نے بھی حدیث ابن عمرؓ ــــ فی الزیارۃ ــــ کی تصحیح کی۔ وغیرہ الک۔

یہی وجہ ہے کہ ان مذکورہ ائمہ محدثین اور ان جیسے دیگر متاخرین علماء حدیث کی تصحیح احادیث کو دیکھ کر حافظ عراقی کو کہنا پڑا کہ :

ولم یزل ذالک داب من بلغ	(معاصرین ابن صلاح کے بعد صرف دو طبقوں
اھلیتہ ذالک منھم۔ تدریب ص۸۷	تک ہی یہ تصحیح حدیث کا سلسلہ محدود نہیں رہا)

بلکہ ماہرین فن کیلئے یہ مسئلہ تصحیح حدیث جاری ہے۔

(باقی آئندہ)